دبستانِ کراچی

کے

ممتاز شعراء

نعیم الحق صبا ضیائی

۷۸۶

بصد خلوص و احترام
جناب ڈاکٹر خلیق انجم صاحب
کی خدمت میں۔
نعیم الحق صبا
۲۱ جون ۱۹۹۱ء

دبستانِ کراچی کے ممتاز شعراء

(مختصر تنقیدی جائزہ اور نمونۂ کلام)

(حصّہ اوّل)

نعیم الحق صبا ضیائی

95-8

خاکِ مُسلّح

مجھے خبر ہے، نہ گھبرا شریکِ راہِ دراز
کہ زیرِ سطحِ مُسطّح ہے کیا نشیب و فراز

بُرہمنوں نے بغاوت پہ باندھ لی ہے کمر
لرز رہے ہیں بُتانِ دُرونِ پردۂ راز

ہزار شکر کہ تعمیرِ نو میں ہے سرگرم
وہ آدمی، کہ جو تھا کعبہ ساز و دیر نواز

دھڑک رہا ہے دلِ طائرانِ سدرہ نشیں
اُٹھا رہی ہے زمیں دیدۂ قدر انداز

اُڑی ہُوئی ہے تب و تاب چہرۂ خورشید
ہُوا ہے ذرہ کچھ اِس طرح مائلِ پرواز

زمیں پہ خشت و خزف نے دُہل اٹھایا ہے
فضائیں پرمہ و انجم ہیں گوش برآواز

وہ پا چکا ہے رُخِ انکسارِ عشق فروغ
کہ حُسن، بھول گیا ہے غرور کے انداز

لبِ نیاز پہ روشن ہوا ہے ناز کا حرف
دیارِ ناز میں لَو دے رہی ہے شمعِ نیاز

ہر ایک لے میں پرافشاں ہیں سیکڑوں جبریل
بجا رہا ہے تخیل، حریمِ دل میں وہ ساز

زہے جلالتِ خدّامِ عارفانِ جدید
بہرنگاہ کرامت، بہر نفس اعجاز

نہیں یہ منزلِ تمکیں، بڑھے چلو یارو
ابھی تو ہیں فقط افلاک، فرشِ پا انداز

عنانِ قافلۂ موڑو سوئے حریمِ دماغ
کہ دل نہیں ہے رفیقو، محلِ سوز و گداز

بہت غرور نہ فرمائیں ثابت و سیّار
کہ خاک پر حرکت کا ہُوا ہے اب آغاز

بصد شکوہ چلے گا جو آبِ حیواں میں
بنا رہی ہے تمنائے زندگی وہ جہاز

مری رہِ ابدیت پہ چل نہ پائے گا
مسیح و خضر کا یہ اختصارِ عمرِ دراز

ندیم، جوشِ کولمبس کسی بیاباں میں
کہ تا سکوت کے خرمن سے چُن سکے آواز

مرے لہو کی صدا تھا، مری پکار تھا وہ
مری زباں پہ عجب حرفِ بے قرار تھا وہ
اس ایک حرف کا امکان و اعتبار تھا میں
مرے وجود کا امکان و اعتبار تھا وہ
نئے افق تھے معانی کے اس کے پرتو میں
وہ حرف تھا کہ کوئی مہرِ زرنگار تھا وہ
میں اس سے جیت گیا کتنا کم سواد تھا میں
وہ مجھ سے ہار گیا کیسا ہوشیار تھا وہ
مری نگاہیں پلٹ آئیں اس غبار کے ساتھ
کسی نے یہ نہ بتایا پسِ غبار تھا وہ
یہ بات کیسے بتاؤں کہ خود غرض تھا میں
اور اس کے بعد بھی یارِ وفا شعار تھا وہ
سمجھ رہا تھا جسے گوشۂ خیال میں ایک
میں اس کو ڈھونڈنے نکلا تو بے شمار تھا وہ
کبھی جو اس کو صفِ دشمناں میں دیکھو تم
تو اس کو یاد دِلانا کہ میرا یار تھا وہ

آج تک اُس قرب کی لذت سے دل آباد ہے
وہ قرارِ جاں ہمیں پہلو بہ پہلو یاد ہے
کس نے پوچھا حال اُن آشفتگانِ شوق کا
شہر بھی آباد جن سے دشت بھی آباد ہے
رائیگاں جاتی نہیں ہے کاوشِ اہلِ جنوں
ضربِ تیشہ آج بھی زخمِ سرِ فرہاد ہے
آج اپنے غمزدوں کو تو نے پہچانا نہیں
یہ وہی ہیں جن سے تیری رہگذر آباد ہے

ہم وہ ہجراں نصیب ہیں جن کا
ہر نفس جاگتا ہے آنکھوں میں
دیدگی رہ گزر میں کون آیا
رنگ سا بھر گیا ہے آنکھوں میں
کیا حزیمتی، کیا غم ہے کچھ تو کہو
جبکہ یہ سلسلہ ہے آنکھوں میں
جانے کیوں ہے پلک پلک سوزاں
جانے کیا واقعہ ہے آنکھوں میں
ایک آنسو، کہ جس پہ نازاں تھے
وہ بھی کمہلا گیا ہے آنکھوں میں،

ابنِ انشا

جدید شاعری، کالم نویسی اور سفرناموں کے حوالے سے ابنِ انشا کو شہرت حاصل ہے۔ وہ ایک ذہین اور بلند حوصلہ فنکار تھے۔ انہوں نے اپنی فکر سے معاشرے کی بھرپور عکاسی کی۔ ان کے کلام میں ایک ولولہ، تڑپ اور سوز پایا جاتا ہے۔ ابنِ انشا کی غزلیں جو میر کے انداز میں لکھی گئی ہیں وہ بھی بڑی ہی اثر انگیز ہیں۔ ان کی شاعری میں قدیم اور جدید دونوں پہلو علیحدہ علیحدہ ملتے ہیں بعض غزلیں خالص کلاسیکی ہیں اور بعض بالکل جدید۔ ان کی یہ شعوری کوشش ایک کامیاب تجربہ کے طور پر انہیں مقبول بنا گئی۔ ابن انشا نے نظمیں بھی لکھیں لیکن ان کی غزلیں زیادہ مشہور ہوئیں۔ کالم نویسی کے حوالے سے انہوں نے خود کو منوالیا تھا ان کی تحریریں جان دار ہیں۔ ابنِ انشا نے اپنے مخصوص اسلوبِ نگارش کے سبب ایک ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔

خاموش رہو

کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ ـــــ کچھ نہ کہو، خاموش رہو
اے لوگو خاموش رہو ـــــ ہاں اے لوگو، خاموش رہو

سچ اچھا، پر اس کے جلَو میں، زہر کا ہے اِک پیالا بھی
پاگل ہو؟ کیوں ناحق کو سقراط بنو، خاموش رہو

حق اچھا۔ پر اس کے لیے کوئی اور مرے تو اور اچھا
تم بھی کوئی منصور ہو جو سُولی پہ چڑھو؟ خاموش رہو

اُن کا یہ کہنا سورج ہی دھرتی کے پھیرے کرتا ہے
سر آنکھوں پر، سورج ہی کو گھومنے دو ـــ خاموش رہو

مجلس میں کچھ حبس ہے اور زنجیر کا آہن چبھتا ہے
پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، خاموش رہو

گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں، من میں کیا کیا موسم ہیں
اِس بگیا کے بھید نہ کھولو، سیر کرو، خاموش رہو

آنکھیں موند کنارے بیٹھو، من کے رکھو بند کواڑ
انشا جی لو دھاگا لو اور لب سی لو، خاموش رہو

جگنو سے

بارش میں ترا یہ دیپ جلے
کبھی بجھ نہ سکے

مجھ کر جو چلے
تری جوت دبے نہیں ـــــ اور بڑھے

اے جگنو جا!
اور نیل گگن کو جا کے بنا کہیں اپنا وطن
اے جگنو جا!
اور چاند کے پاس پہنچ کے چمکتا تارا بن

پروفیسر انجم اعظمی

پروفیسر انجم اعظمی ایک ذی علم شاعر اور منجھے ہوئے نقاد تھے۔ انہوں نے تنقید پر جو کچھ بھی لکھا اسے وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ان کا مطالعہ کلاسیکی اور جدید ادب کے حوالے سے یکساں تھا۔ انہوں نے پابند شاعری بھی کی اور آزاد نظمیں بھی لکھیں۔ انسانیت اور کائنات کے حوالے سے انہوں نے اپنے خیالات کا بھرپور اظہار کیا ہے جس میں وہ کامیاب نظر آئے۔ پروفیسر انجم اعظمی کی غزلیں قدیم اور جدید انداز کا دلکش امتزاج لئے ہوئے ہیں۔ وہ ایک پختہ کار شاعر کی حیثیت سے ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ انہوں نے اپنے فنکارانہ شعور سے کام لیتے ہوئے حقائق کا اظہار بڑی بے باکی سے کیا ہے۔ ان کا اسلوب نگارش صاف شائستہ اور دلنشیں ہے۔ البتہ کہیں کہیں رمزیت اور ایمائیت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ جتنے اچھے انسان تھے اتنے ہی عمدہ فنکار بھی تھے۔

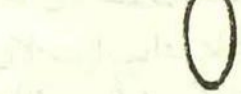

جو شب بھر آنسوؤں سے تر رہے گا — سحر دم دامن دل بھر رہے گا
علاج اکسیر ہو گیا ہے جاں سے — گزر جانے کا جاں سے ڈر رہے گا
ہوا مشکل ترے عاشق کا جینا — ترے کوچے میں آکر مر رہے گا
دلِ وحشی نے کب آرام پایا — ستم کی آگ میں جل کر رہے گا
حیاتِ جاوداں ہو یا کہ دُنیا — ترا بندہ ترے در پر رہے گا
نہ ہو عصیاں تو کیسا حشر کا دِن — کہاں پھر داورِ محشر رہے گا
حقائق سے جو دل اُلجھا ہُوا ہے — دُبی خوابوں کا صورت گر رہے گا
کوئی تو خیر کا پہلو بھی نکلے — اکیلا کس طرح یہ شر رہے گا
نہ بزمِ میکدہ باقی رہے گی — نہ دستِ شوق میں ساغر رہے گا
جو دن ہے آنے والا، بے اماں ہے — قدم گھر سے اگر باہر رہے گا

کوئی تو اعظمی صاحب کو سمجھاؤ
یہ گوشہ شہر سے بہتر رہے گا

عزیز حامد مدنی

عزیز حامد مدنی ایسے ترقی پسند شاعر ہیں جن کے ہاں روایتی جدیدیت نہیں ملتی ہے بلکہ وہ خلوصِ بیکراں اور انسان دوستی کے تقاضوں کو معتدل انداز میں پیش کرتے ہیں۔ انسانی دکھوں کا سیلاب اور حالات کی کربناکی ان کی شاعری میں ملتی ہے مگر ان کے ہاں بعض جدید شعراء کی طرح نعرے بازی کا کوئی گزر نہیں ہے۔ وہ دائمی انسانی اقدار کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے مسائل حاضرہ کو فکر و احساس کے سانچوں میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا ہے کہ صداقت کا ابلاغ نہایت اعتماد سے ہوا ہے۔

ہم اگر عزیز حامد مدنی کے کلام کا غائر مطالعہ کریں تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہیگل، مارکس اور ہربرٹ اسپنسر سے کافی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ مگر اپنے نظریات کا ابلاغ انہوں نے جن خطوط پر کیا ہے وہ خطوط عام ترقی پسند افراد کے انداز سے مختلف ہیں۔ انہوں نے ہیئت کے تجربوں کا خصوصی مطالعہ کیا اور خود بھی نئی ہیئتوں کی طرف راغب ہوئے۔ انہوں نے ایسی نظمیں بھی لکھیں جن میں تین مصرعوں کا ایک ایک بند بھی ملتا ہے ایسی نظموں میں پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ رکھا ہے جس سے تخلیق میں دلکشی بڑھ گئی ہے عزیز حامد مدنی کی غزلیں بھی ان کے پختہ شعور کی آئینہ دار ہیں۔

کیفیت اس کی قبا میں وہ قدِ بالا سے تھی
مضطرب ساحل کی خاموشی دمِ دریا سے تھی

زاویے کیا کیا دیئے تھے تیرے رُخ کو شوق نے
انجمن سی انجمن تھی اور دل تنہا سے تھی

جادۂ بے میل و منزل وقت کا اک خواب تھا
رہگذارِ حال بھی ملتی ہوئی فردا سے تھی

وہ بھی سنگِ محتسب کے نذر آخر ہو گئی
روشنی باقی جو کل تک شعلۂ مینا سے تھی

ذوقِ آرائش کا اک دُنیا تھی آئینہ جسے
گفتگو بھی تھی تو ایسے انجمن آرا سے تھی

جنبشِ دل میں بھی اک صورت جنوں انگیز تھی
یا خرامِ یار سے یا لرزشِ صہبا سے تھی

اب جو تو آیا ہے خود سُن لے سوادِ شہر میں
وہ حکایت زُلف کی جو نکہتِ رُسوا سے تھی

وہ بھی اک رو تھی تغیّر کی جو پہنچی شہر تک
کیا بگولا بن کے اُٹھی وہ دلِ صحرا سے تھی

سُرمہ سا آنکھوں میں تھی جاگی ہوں رُوحِ وصال
درمیاں اک ہجر کی شب، رنجشِ بیجا سے تھی

تھی سرِ کہسار اک چوگانِ برق و باد سی
رخش سے بادل تھے پیدا آگ نعلِ پا سے تھی

صبح سے پہلے رُخِ جاناں پہ جو رو داد تھی
پھر نہ آئی جو شکستِ رنگ کی انشا سے تھی

○

ہزار وقت کے پرتو نظر میں ہوتے ہیں
ہم ایک حلقۂ وحشت اثر میں ہوتے ہیں

کھلا یہ دل پہ کہ تعمیرِ بام و در ہے فریب
بگولے قالبِ دیوار و در میں ہوتے ہیں

وہی ہیں آج بھی اس جسمِ نازنیں میں فسوں
جو شاخِ گل میں، جو موجِ گہر میں ہوتے ہیں

طلسمِ خوابِ زلیخا و دامِ بردہ فروشں
ہزار طرح کے قصّے سفر میں ہوتے ہیں

گذر رہا ہے تو آنکھیں چُرا کے یُوں نہ گذر
غلط بیاں بھی بہت رہگذر میں ہوتے ہیں

سرشتِ گل ہی میں پنہاں ہیں سارے نقش و نگار
ہنر یہی تو کفِ کوزہ گر میں ہوتے ہیں

قمر جلالوی

ایک زمانہ تھا کہ قمر جلالوی ہر مشاعرے کی زینت تھے۔ وہ قدیم رنگ میں کہتے تھے مگر اپنے منفرد انداز کے سبب بے حد مقبول ہوتے۔ ان پر ایک خاص دور ختم ہوگیا۔ روزمرہ اور محاورات کا برمحل اور بے ساختہ استعمال ان کے کلام میں جا بجا پایا جاتا ہے۔ قمر جلالوی زبان و بیان کے حوالے سے اپنے عہد میں اپنی مثال آپ تھے۔ سادہ الفاظ کو اس طرح استعمال کرتے تھے کہ سامع یا قاری پھڑک جاتا تھا۔ انہوں نے سہل الفاظ میں گہری معنویت پیش کرتے ہوئے بلند مقام حاصل کیا۔ ان کے ہاں بے ساختگی کے ساتھ ساتھ فکر کی قدرت کے سبب دلکش شاعرانہ فضا پائی جاتی ہے۔
بعض افراد کے ہاں جذبوں کی فراوانی ہوتی ہے مگر خیال اتنا رفیع نہیں ہوتا اور بعض کے ہاں رفعتِ تخیل ہوتی ہے مگر جذبے کی اثر آفرینی اس قدر نہیں ہوتی ہے۔ قمر جلالوی کی یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے جذبوں اور تخیلات کی یکساں فراوانی کے سبب خود کو منفرد بنا دیا۔ ان کا لب و لہجہ سب سے جدا اور اثر انگیز ہے لسانی محاسن ان کی غزلوں میں بھی خوب پائے جاتے ہیں اور ان کے مذہبی کلام میں بھی۔

ڈاکٹر نعیم تقوی

بقول پروفیسر ممتاز حسین ڈاکٹر نعیم تقوی عالمِ ہفت زباں ہیں۔ فلسفہ، مغربی ادبیات و تنقید سے انہیں گہرا لمس ہے۔ ان کی تنقیدیں اعلیٰ معیاری ہوتی ہیں۔ ماہر لسانیات کی حیثیت سے بھی نعیم تقوی صاحب کو سند مانا جاتا ہے انہوں نے مختلف زبانوں میں قابلِ صد ہا ستائش سخن آرائی کی ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کا ہر زاویہ واضح نظر آتا ہے۔ فکری گہرائی اور الفاظ کا در و بست ایسا ہوتا ہے جس سے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر نعیم تقوی نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع رسا کے جوہر دکھلائے ہیں۔

ان کا کلام تہذیبِ نفس اور تطہیرِ معاشرہ کے حوالے سے مثالی ہے۔ ڈاکٹر نعیم تقوی نے حوصلہ مندی، بلند نظری اور بے باکی سے اپنے جذبات و احساسات کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ ان کی ہمہ گیری اور ہمہ جہتی اہل قلم و اہلِ نظر پر عیاں ہے۔ مختصر یہ کہ جدید حسیت اور عصری تقاضوں کے حوالے سے وہ بحیثیت شاعر ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

روبرو میرے ہے وہ لطف و عطا کا چہرہ
مسخ جس نام سے ہو جور و جفا کا چہرہ

کاغذی پرزے کی مانند سہی آپ کا ہوں
مجھ کو دیکھا ہے تو اترا ہے ہوا کا چہرہ

فخرِ انساں سے ملا معرفتِ ذات کا درس
کیوں نہ تابندہ رہے میری انا کا چہرہ

علم کے شہر کے در پر جو عقیدت سے جھکا
میرا ہر شعر ہوا فکرِ رسا کا چہرہ

دھوپ کا قرض ادا ان کے غلاموں نے کیا
گرچہ تھا سامنے پرہول ہوا کا چہرہ

مجھ کو جھلسائے گا یہ ہجر کا موسم کب تک
تر ہے اشکوں سے تمنائے بقا کا چہرہ

کتنے انسان ہیں بے برگ درختوں کی طرح
دیکھئے کتنا ہے پژمردہ فضا کا چہرہ

رات دن ان کی مودّت میں ہوں شاداں تو ہی
نام سے جن کے منوّر ہے دعا کا چہرہ

منقبت حضرت علیؑ

فکرِ اعلیٰ ہو گئی روشن حوالہ مل گیا
آپ کی چاہت کا جس کو بھی سویرا مل گیا

خوش محمد مصطفیٰؐ ہیں خانۂ معبود میں
حق کی جانب سے انہیں پہلا صحیفہ مل گیا

اُس کا عکسِ نقشِ پا ظلِّ ہما سے ہے سوا
خوبیٔ قسمت سے جس کو تیرا سایہ مل گیا

ہے یہ اک روشن حقیقت جس پہ شاہد ہے حرم
کیسے بے سایہ کہوں حضرتؐ کا سایہ مل گیا

جسکے نقطوں سے ہے اب نہج البلاغت آشکار
نطق کی صورت میں اک ایسا شمارہ مل گیا

کیوں نہ حرفوں کے قبیلے میں رہوں میں محترم
مدحِ بابِ علم میں ہر لفظ عمدہ مل گیا

جی اٹھا ہے ہر مسافر چلچلاتی دھوپ میں
تحفۂ جاں بخش جب تیری صدا کا مل گیا

انتسابِ زیست ہے تقویٰ بنامِ مرتضیٰؑ
خضر کی صورت مجھے ہر ایک لمحہ مل گیا

غزل

آرزوؤں کا شکستہ آئینہ رہنے دیا
اُس نے آنکھوں میں مری اک رتجگا رہنے دیا

وُہ گیا ہے جب سے میرا کوئی موسم ہی نہیں
سنگ دل نے مجھ کو بے آب و ہوا رہنے دیا

اُس کے دستِ ظلم کا یہ بھی تو ہے اک معجزہ
میرے خوابوں کیلئے رنگِ حنا رہنے دیا

لے گیا ہے میری بینائی بھی اپنے ساتھ ساتھ
کیا ہوا گر طاق کا روشن دیا رہنے دیا

نام کی تختی پڑی ہے گھر تو سارا ڈھ گیا
بارشوں نے اس طرح میرا پتہ رہنے دیا

تتلیوں کی ہجرتوں سے صاف ظاہر ہو گیا
اس بدلتی رُت نے اب گلشن میں کیا رہنے دیا

کس طرح تقویٰ دعائیں دشمنِ ایماں کو دوں
لے گیا ہر اک اثر دستِ دعا رہنے دیا

میری نظروں میں تری یاد کا جو آنچل ہے
ظلمتِ ہجر میں میرے لئے اک مشعل ہے

تیری الفت کا نہ کیوں اس کو پیامی سمجھوں
جھیل سی آنکھوں سے بہتا ہُوا جو کاجل ہے

کشتۂ جور و جفا ہُوں کوئی مجھ سے پوچھے
محفلِ ناز جسے کہتے ہیں وہ مقتل ہے

وحشتوں کا کہیں پہرہ کہیں سناٹوں کا
جس کو سب کہتے ہیں دنیا وہ بھرا جنگل ہے

زخم خوردہ ہے تو بازو نہیں پھیلا سکتا
پیڑ پر ہے جو پرندہ وہ بہت بیکل ہے

وہ توانائی مجھے ذات کے عرفاں سے ملی
ناتواں ہوتے ہوئے مجھ میں بڑا کس بل ہے

قحط سالی میں یہ تقویٰ نے بجا طور کہا
جو نہ برسے اُسے ہرگز نہ کہو بادل ہے

محشر بدایونی

محشر بدایونی کا شمار دبستان کراچی کے بلند پایہ شعراء میں ہوتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے کلاسیکی انداز میں شاعری کی اور برسوں مشقِ سخن رہی مگر کوئی ۲۰ سال سے ان کلام میں حیرت انگیز جدیدیت پائی جاتی ہے جو ان کے کسی ہم عمر شاعر میں مشکل سے ہی مل سکتی ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ اتنا پرانا شاعر خود کو اس قدر جدیدیت سے ہم آہنگ کرے۔ محشر صاحب خصوصی طور پر چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑی بڑی باتیں بیان کر جاتے ہیں۔ نئی تراکیب اور الفاظ کو مخصوص طرح استعمال کرنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ الفاظ مشکل نہیں ہوتے ہیں مگر مشکل سے مشکل مسائل پر وہ آسانی سے تنقیدی رائے پیش کرتے ہوئے اپنی شاعری کو ایک خاص ڈگر پر قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے کلام میں ندرتِ تخیل اور لطافتِ زبان کے پہلو بھی اکثر ملتے ہیں۔ ان کا کلام بڑی دلچسپی سے سنا اور پڑھا جاتا ہے۔ محشر صاحب ایک شائستہ لب ولہجے کے شاعر ہیں۔

ہوا نے مژدے بصد زمزمہ سنائی دیئے
سو کچھ سنائی دیئے کچھ نہیں سنائی دیئے

عطا مجھے بھی کرے وہ کوئی سلیقۂ حرف
وہ جس نے غنچوں کو آدابِ لب کشائی دیئے

گزر گئے وہ فقیر اب کہاں نظر آئیں
غریب شہر میں تھے تو کیسے دکھائی دیئے

زمیں پہ ڈھیر ہیں ہم اور اسی زمیں نے تمہیں
صلے سفر کے بغیر شکستہ پائی دیئے

رہِ مراد میں اک خوابِ مہرباں نے ہمیں
دیا سکوں بھی مگر دکھ تو انتہائی دیئے

سبھی گرانیِ خاک اپنی روح پر سہ لی
خراجِ وقت کے جتنے تھے پائی پائی دیئے

ذرا گزند سے کشتی کو کیا نکال دیا
ہَوا نے بوجھ بہت بادباں پہ ڈال دیا

پھر ایک قرض نمو تھا لہو سو موسم نے
یہ قرض اُتارنے کو اور ایک سال دیا

بڑھا تو ایسا بڑھا آسماں کا زورِ جلال
مجھے احاطۂ پرواز سے نکال دیا

جو سکّہ مَیں نے بچا کر رکھا وہ کھوٹا تھا
سو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور کنویں میں ڈال دیا

مِلا تھا دشت میں اک شہزادِ شہر آ کر
گیا تو خیمۂ جاں تک غبار اُچھال دیا

مری تلافیِ حرفِ عتاب پر اُس نے
جواب کیا دیا اِک سخت تر سوال دیا

قرارِ جاں مجھے بخشا اور انتہا کا قرار
پھر اُس نے رنج دیا رنج بھی کمال دیا

کوئی بھی بات نہ دل سے سُنی نہ کی محسوس
مگر وہ بات جسے اُس نے ہنس کے ٹال دیا

سفر طویل تھا۔ اجرِ سفر بھی کم تو نہ تھا
کہ زخم زخم نے پیرایۂ خیال دیا

مرا گماں تھا یہ تھک کر بکھر ہی جاؤں گا
شکستگی نے تو بڑھ کر مجھے سنبھال دیا

مشفق خواجہ

مشفق خواجہ ایک عمدہ تحقیق نگار اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ انہوں نے مطالعہ کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اس لئے ان کی نثری تحریر اور شاعری ان کے بلند ذوق کی آئینہ دار ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں فکری انداز سے لکھتے ہیں اور سطحی باتوں کو قریب آنے نہیں دیتے۔ ان کی شخصیت نثر اور نظم دونوں حوالوں سے ممتاز ہے۔

مشفق خواجہ نے بابائے اردو کے ساتھ بھی ایک عرصہ گزارا اور انجمن ترقی اردو سے بھی ان کی وابستگی رہی اس لئے انہیں تحقیق اور جستجو سے خصوصی شغف ہے جو ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ ان کی شاعری میں صحت مند فکر ہے اور ایسا سلیقہ پایا جاتا ہے جسے ہم مہذب شاعری کہہ سکتے ہیں۔ وہ نشاط و غم دونوں پہلوؤں کو خوش اسلوبی سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں کشش اور جاذبیت پائی جاتی ہے جو ان کے مشہور ہونے کا سبب ہے۔

سلام

بیٹھا ہے مشکلات کے رستے پہ ہار کے
اُو بدنصیب دیکھ علیؑ کو پکار کے

ہم سے قدم چھڑا دے شہِ ذی وقار کے
دنیا اِسی میں مر گئی سر مار مار کے

ہیں بسترِ رسولؐ پہ حیدرؑ یہ کب کھُلا
انگڑائی جبکہ لی شبِ ہجرت گذار کے

یہ معجزہ ہے عرش پہ آئے گئے رسولؐ
نقشِ قدم مگر نہ ملے رہگذار کے

مرحب کا قتل بھی کوئی خیبر میں قتل تھا
پھینکا تھا ذوالفقار کا صدقہ اُتار کے

خیبر کا در ہوا تھا یہ اک اک سے کہکے بند
تم سے بہت سے مر گئے سر مار مار کے

خیبر کے در نے کھُل کے اشارہ یہ کر دیا
مظہر یہی ہیں قوتِ پروردگار کے

خود آپ اپنی آگ ہی میں جل نہ جائیں ہم
کب تک بیادِ شمع رخاں جی جلائیں ہم

اب سوچتے ہیں آبلہ پایانِ راہِ شوق
سایہ کہیں ملے تو ذرا بیٹھ جائیں ہم

ہم سے ہے تیری شانِ تغافل کا اعتبار
شاید، اسی سبب سے تجھے یاد آئیں ہم

کس کو ملی جو ہم کو ملے دادِ بے کسی
آؤ خود اپنے حال پہ آنسو بہائیں ہم

تھا ایسا حشر خیز سکوتِ شبِ الم
دیتے رہے ہوں جیسے کسی کو صدائیں ہم

کیا تیری خلوتوں کا ہو عالم اگر کبھی
موجِ خیال بن کے ترے دل میں آئیں ہم

دامن کشِ خیال ہیں کتنی ہی صورتیں،
اب کس کو یاد رکھیں کسے بھول جائیں ہم

اب جسکو دیکھئے وہی پرسانِ حال ہے
کس کس کو تیرے غم کا فسانہ سنائیں ہم

سب حقائق نظر آنے لگے افسانہ ہمیں
وحشتِ دل نے کسی کام کا رکھا نہ ہمیں

ناز فرماتے ہم ارزانیٔ دل پر کیا کیا
نگہِ لطفِ خریدار نے پوچھا نہ ہمیں

ہم گدایانِ رہِ شوق سراپا دل تھے
دیکھنے والے نے افسوس کہ سمجھا نہ ہمیں

گردشِ جام سے بے نام تعلق کے سبب
گردشِ دہر نے دیکھا ہے رقیبانہ ہمیں

سیلِ وحشت در و دیوار سے رکتا ہے کہیں
بستیوں میں بھی ملی رونقِ ویرانہ ہمیں

کس توقع پہ کریں تیری تمنا ہم لوگ
ڈھونڈنے پر بھی ملا جب کوئی خود سا نہ ہمیں

حاصلِ عشق ہیں وہ تلخ حقائق مشفق
یاد آئیں گے جو افسانہ در افسانہ ہمیں

شامِ فراق بھی گئی صبحِ وصال بھی نہیں،
عشق وہاں ہے اب جہاں تیرا خیال بھی نہیں،
ذوقِ طلب بھی دل میں ہے خوئے سوال بھی نہیں
غم وہ عطا ہوا مجھے جس کی مثال بھی نہیں
ہاں اسی انجمن میں ہم شمع کی طرح جل بجھے
جز غمِ بے کسی جہاں پرسشِ حال بھی نہیں
دل ہے وہ کم نصیب جو خود سے گریز پا رہا
کوئے جنوں کا راستہ ورنہ محال بھی نہیں،
ذہن کے آئینہ میں یوں عکس بہار رفتہ ہے
وقت کی بے نیازیاں وجہِ ملال بھی نہیں
شہرِ طرب کے ساکنو! مجھ سے کنارہ کش ہو کیوں؟
میری نگاہ میں تو اب کوئی سوال بھی نہیں

جمیل الدین عالی

عالی جی کی شاعری میں حب الوطنی کے عناصر نمایاں ہیں ان کے ملّی نغموں کو شہرت دوام حاصل ہے۔ وہ اپنے جذبات واحساسات کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ پاکستان کے شعراء میں دوہا نگاری کے حوالے سے انہیں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ مشاعروں میں ان سے دوہوں کی فرمائش ضرور ہوتی ہے۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور خوب کہی ہیں مگر انہیں دوہا نگار کی حیثیت سے زیادہ جانا جاتا ہے شائستگیٔ فکر اور جاذب اثر اسلوب کے سبب جمیل الدین کو عصرِ حاضر میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

عالی جی ایک رسیلے کوی ہیں۔ ان کے کلام میں سوز وگداز اور موسیقیت کے عناصر نمایاں ہیں۔ جب وہ اپنا کلام سناتے ہیں تو لوگ ہمہ تن گوش ہوجاتے ہیں کلام بھی خوب ہوتا ہے اور پڑھنے کا انداز بھی خوب ہے اس لئے وہ محفل پر چھا جاتے ہیں۔ عالی جی کے کالم بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ نباضِ وقت کی حیثیت سے کالم لکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ عالی جی نثر اور نظم دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔

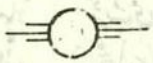

کوئی بہار کی خاطر کوئی خزاں کے لئے
بس ایک میں ہی رہا صرف گلستاں کیلئے

الٰہی مجھ سے نظر چھین لے کہ اہلِ نظر
تمام عمر تڑپتے ہیں رازداں کے لئے

مسرتیں جو ملیں تیرے لُطفِ پیہم سے
محل رہی ہیں کسی جورِ ناگہاں کیلئے

مجھے ہیں خار سے کچھ خاص نسبتیں کہ یہ گُل
بہار میں ہے کھُلا رونقِ خزاں کیلئے

اک گہرا سنسان سمندر جسکے لاکھ بہاؤ
تہہ میں بھی ہے حال وہی ہے تہہ کے اوپر حال
لئے پھریں دکھ اپنے اپنے راجہ میر فقیر
روٹی جسکی بھینی خوشبو ہے ہزاروں راگ
کون ہے جسکی آنکھ کا موتی میری آنکھ میں ہے

تیری ہی ہے اسکی اک اک موج پہ جیون ناؤ
پنچھی بچ کر جائے کہاں جب جل ہی سارا جال
کڑیاں لاکھ ہیں رنگ برنگی ایک مگر زنجیر
نہیں ملے تو تن جل جائے ملے تو جیون آگ
کون ہے جسکی خوشبو میرے ساتھ ہزاروں کوس

حیدرآباد کا شہر تھا بھیا اندر کا دربار
واہ تلنگانے کی مائیں جنہیں جو ایسے لال
بمبئی پٹنہ حیدرآباد نہ آئے ہم کو راس

ایک ایک گھر میں سو سو کمرے ہر کمرے میں نار
جو اندر سے ہیرے موتی باہر سے کنگال
پیٹ کو بھر کر کیا کیجے جب من ہی رہے اداس

راغب مرادآبادی

راغب صاحب کو رباعی کے حوالے سے دبستانِ کراچی میں اہمیت حاصل ہے۔ بحیثیت رباعی گو وہ اس وقت برصغیر کے صفِ اول کے شعراء میں شامل ہیں۔ پروفیسر اختر انصاری اور پروفیسر منظور حسین شور کے بعد ان کی رباعیات فکر و فن کے حوالے سے امتیاز رکھتی ہیں۔ انہوں نے رباعیات میں نہ صرف اخلاقی مضامین نظم کیے ہیں بلکہ حیات و کائنات کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ نظم ہو یا غزل راغب مرادآبادی کو دونوں صنفوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ وہ ایک ذی علم فنکار ہیں۔ عروض داں کی حیثیت سے بھی انہیں معتبر سمجھا جاتا ہے موجودہ دور میں تاریخ گوئی کا رجحان خاصا ماند پڑ گیا ہے مگر چند افراد کی بدولت یہ فن زندہ ہے ان میں راغب مرادآبادی کا نام بھی آتا ہے۔ فی البدیہہ گوئی میں بھی مہارت حاصل ہے۔ مشاعروں کی نظامت کرنے میں بھی راغب کا انداز منفرد ہے۔

رُباعیات!

عِلم و حِلم و عمل کا ہے اک کہسار
اِسلام کا داعی، وہ رسولِ احرار
والہ ہے اسی کا حاکم و مالکِ مُلک
عالم عالم کو ہے محمدؐ درکار

مولیٰ، دل ہے ملول، اِرحم اِرحم
ہو عفو کی دُور دُھول اِرحم اِرحم
وارد مسدود، راہ طالع عاصی
اَعلم، اَعدل، رسولؐ اِرحم اِرحم!

سب کچھ، فیضِ نبیؐ سے جانا ہم نے
سیکھا نہیں، نازِ عقل اٹھانا ہم نے
اک مخبرِ صادق پہ ہے اپنا ایمان
اللہ کو بے دلیل مانا ہم نے

عِلم و حکمت کے جس نے موتی رولے
تائید میں جس کی سنگ ریزے بولے
منزل پہ نجات کی پہنچ جائے گا
نقشِ قدم اس کے چوم، پیچھے ہولے

حنیف اسعدی

جناب حنیف اسعدی ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد ماجد حضرت اسعد شاہجہاں پوری اپنے زمانے کے معتبر شاعر تھے اور بحیثیت استادِ فن انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حنیف اسعدی نے شاعری ورثے میں پائی اور اس نعمتِ خداداد کو خوب سے خوب تر بنانے میں بڑی محنت سے کام لیا۔ انہوں نے نعت گوئی ایک مقدس فریضہ سمجھتے ہوئے بارگاہِ نبوی میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کا نعتیہ سرمایہ ایک اعلیٰ عقیدت کدہ بھی ہے اور اس کی ادبی حیثیت بھی ہے۔ پاکیزہ جذبات و احساسات کو شائستہ الفاظ اور عمدہ فکر کے ساتھ حنیف اسعدی نے نعت کی شکل میں پیش کیا ہے یہی سبب ہے کہ ایک عمدہ نعت گو کی حیثیت سے انہیں شہرت حاصل ہے۔ موجودہ زمانے میں دبستانِ کراچی کے نعت گو شعراء میں انہیں فکر و فن کے حوالے سے جو امتیاز حاصل ہے اس کا اعتراف ضروری ہے۔

زباں پہ جب بھی مدینے کی گفتگو آئی
نگاہ گنبدِ خضرا کو جا کے چھو آئی

کبھی ہوا مری آنکھوں کی تشنگی کا علاج
کبھی کبھی مرے کانوں میں گفتگو آئی

کسی نے جب بھی کیا تذکرہ شمائل کا
تو میری آنکھوں میں وہ شکل ہو بہو آئی

کیا ہے دل نے بہر لمحہ اُن کا ذکرِ جمیل
جو سانس اس طرح آئی تو باوضو آئی

نفس نفس میں در آیا ہے آگہی کا شعور
ہوائے کوئے مدینہ جو کو بکو آئی

وہ روشنی جو فضائے حرم میں دیکھی تھی
کبھی نظر کے کبھی دل کے رُوبرو آئی

حنیف خاکِ مدینہ ملی جو چہرے پر
تو اپنے جسم سے اُس پیرہن کی بُو آئی

تارِ تیغِ خونِ شاہ چھپائیں تو کس طرح
یہ نقش رکھ گئی ہے جو زینب اُبھار کے

لیلےٰ کے دل کو دیکھ رہے ہیں شہِ زمن
اکبرؑ کو رن میں بھیجا ہے گیسو سنوار کے

اصغرؑ جگر کو تھام کے روتی ہے فوجِ شام
تم تیر کھا کے آئے ہو یا تیر مار کے

اکبرؑ تمہارا باغِ جوانی اُجڑ گیا
لیلےٰ نے چار دن بھی نہ دیکھے بہار کے

رو باہ جنگِ عون و محمد پہ کہتے تھے
یہ شیر جانے چھوٹ گئے کس کچھار کے

تاریکیاں یہ شامِ غریباں کی اے قمرؔ
تارے بھی چھپ گئے فلکِ کج مدار کے

جانے سوال کیا ہوئے تربت میں اے قمرؔ
چپ ہو گئے تھے ہم تو علیؑ کو پکار کے

حمایت علی شاعر

حمایت علی شاعر سلامت روی اور کرب آگہی کے شاعر ہیں وہ زندگی کے امکانات کو شعوری طور پر اس طرح واضح کرتے ہیں کہ زندہ اور سچے خیالات کی روح ان کی غزل کوئی میں جلوہ گر ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں نئی معنویت کو اس طرح سمویا ہے کہ حوصلہ مندی اور آرزومندی سے ایک ایسی فضا قائم ہوگئی ہے کہ نشاط و غم صداقت کے پیمانوں میں ملتے ہیں۔ وہ جس اعتماد سے گردشِ حالات سے نبرد آزما ہوتے رہے ہیں وہی اعتماد ان کے فن میں بھی در آیا ہے۔ وہ یاسیت کو نہیں گردانتے ہیں بلکہ رجائیت کے سہارے لمحوں کی روح کو تر و تازہ رکھنے کا فن جانتے ہیں۔ وہ الفاظ اور معانی کی یکجائی کے قائل ہیں اس لئے ان کے کلام میں شگفتگی بھی پائی جاتی ہے اور تیکھا پن بھی۔ جدید نظم کے حوالے سے بھی انہوں نے تجربے کئے ہیں وہ قارئین کو متوجہ کرتے ہیں۔ اگرچہ تین مصرعوں پر مشتمل کلام متقدمین کے ہاں بھی ملتا ہے جسے عام طور پر مثلث کہا جاتا تھا مگر اس کا رواج زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ حمایت علی شاعر نے ثلاثی کہہ کر ایک ایسی ہیئت کو مرکزِ توجہ بنا دیا جس کے امکانات دھندلا چکے تھے۔

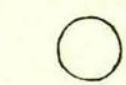

نوشش ہو رہے ہیں لوگ رقیبوں کے بخت پر
شہزادیِ سبا ہے سلیماں کے تخت پر

بیٹھے ہوئے زمیں پہ جگالی میں ہیں مگن
وہ جانور جو چڑھ نہیں سکتے درخت پر

شائد کہ راس آگئیں جنگل کی وحشتیں
چونکا نہیں ہے کوئی صدائے کرخت پر

اب سوچتے ہیں، ابر ہے دوشِ ہوا پہ کیوں
کیوں آشیاں بناتے ہیں طائر درخت پر

پتّوں کی تالیاں ہیں کہ گھوڑوں کی ٹاپ ہے
رکھنا نگاہ ہم سفرو اپنے رخت پر

کوئی تو ہو جو اشک بہائے میری طرح
بکھری ہوئی متاعِ دلِ لخت لخت پر

شاعر یہ کیا زمین چُنی شعر کے لئے
تیشہ چلائے جیسے کوئی سنگِ سخت پر

رفاقت

شب میں سورج کہاں نکلتا ہے
اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

فرق

کچھ بھی نہیں ہے فرق سفید و سیاہ میں
پھوٹی ہے جب بھی کوئی کرن، رات ہو کہ دن
سائے نکل پڑے ہیں اجالے کی چاہ میں

بیگانگی

کون دنیا میں رفیقِ غمِ جاں ہوتا ہے....
دل میں جاگ اٹھتا ہے جب بھی کوئی سویا ہوا درد
قطرۂ اشک بھی پلکوں پہ گراں ہوتا ہے

اسلوب

کس طرح تراش کر سجائیں
نادیدہ خیال کے بدن پر
لفظوں کی سِلی ہوئی قبائیں

شاعر

ہر موجِ بحر میں کئی طوفاں ہیں مشتعل،
پھر بھی رواں ہوں ساحلِ بینام کی طرف
لفظوں کی کشتیوں سجائے متاعِ دل

رشید انجم

رشید انجم صاحب ایک ماہر عروض فنکار کی حیثیت سے اپنے معاصرین میں امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کے شاعرانہ قامت کا اندازہ ان کے کلام کی پختگی سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مختلف اصنافِ سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے مگر غزل ان کی محبوب صنف ہے۔ عصری تقاضوں کو وہ اپنی غزلوں میں اس مہارت سے پیش کرتے ہیں کہ حیات کی تلخی اور شیرینی ایک دلسوز اور دلکش امتزاج لئے ہوئے نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز بھی پایا جاتا ہے۔ اور علوئے تخیل بھی جس کے سبب ان کی شاعری حسنِ اعتبار رکھتی ہے۔ رشید انجم صاحب اردو کے فروغ کے لئے ایک عرصے سے کوشاں ہیں اور اس معاملے میں وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ ان کا ایک حلقہ ہے اور وہ اپنے تلامذہ پر بڑی محنت کرتے ہیں۔

رشید انجم نے کئی مرثیے بھی کہے ہیں۔ یہ مرثیے رثائی انداز کے علاوہ جدید موضوعات کے حوالے سے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مرثیہ کے مقصد کو بھی واضح کیا ہے اور حیات کے مختلف پہلوؤں کو بھی ان میں اجاگر کیا ہے۔ ان کی پختہ کاری غزلوں کی طرح مرثیوں سے بھی ظاہر ہے۔

میدانِ کارزار میں رہتی ہے ہوشیار
یہ دائمی حیات ہے جرأت کا شاہکار
رکھتی ہے اپنے پختہ عزائم پہ اختیار
دشمن کا وار روک کے کرتی ہے اپنا وار
تعداد کو غنیم کو یہ دیکھتی نہیں
تیغوں سے جو فنا ہو یہ وہ زندگی نہیں

یہ آتشیں حیات دمکتی ہے دور تک
تاریک راستوں میں دمکتی ہے دور تک
یہ ذوالفقار بن کے لپکتی ہے دور تک
یہ صاعقہ خرام چمکتی ہے دور تک
گرتی ہے دشمنوں پہ یہ دیوار کی طرح
چلتی ہے گردنوں پہ یہ تلوار کی طرح

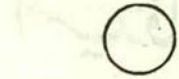

اس عمرِ جاوداں کی حقیقت عجیب ہے　　جذبہ وقار حوصلہ ہمت عجیب ہے

کاٹے سروں کی فصل یہ طاقت عجیب ہے　　دشمن پکار اُٹھے یہ زراعت عجیب ہے

دنیا کے اختیار سے باہر نکل گئی

منہ کھول کر چلی تو اجل کو نگل گئی

اس عمر کی گرفت جہاں سخت ہوگئی　　کفّار کی حیات وہاں پست ہوگئی

تلوار کی طرح جو سرِ دست ہوگئی　　تن کاٹ کر زمین میں پیوست ہوگئی

اس زندگی نے ظلم کی دیوار توڑ دی

اک پل میں ظالموں کی کلائی مروڑ دی

امید فاضلی

امید فاضلی نے شاعری کو ایک فن کی حیثیت سے اختیار کیا اور اسے سلیقہ سے برتا ہے۔ اساتذہ کے کلام کا گہرا مطالعہ بھی ان کا رہنما رہا۔ وہ غزل اور مرثیے میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں اور دونوں صنفوں میں ان کا تخلیقی عمل قابل تعریف رہا ہے۔ عصر حاضر کے تقاضوں پر ان کی گہری نظر رہی اور وہ شعوری طور پر اپنے فرائض منصبی میں بحیثیت شاعر کامیاب ہوئے۔ ان کے ہاں فکر کی کمی نہیں ہے۔ اور اسلوب میں روانی اور دلکشی ہے۔ غزل ہو یا مرثیہ ان کی ہر تخلیق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انسانی اقدار کا احترام کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس راہ پر گامزن ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا انداز قطعی واعظانہ نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک شاعری کے ذریعہ زندگی کی صحت مند فضا قائم کی جاسکتی اور اس کے لئے ضروری ہے کہ شاعر میں نقد حیات کی پوری صلاحیت ہو۔ ان کی شاعری تنقید حیات سے عبارت ہے۔ مرثیے معیاری لکھے ہیں اور یہی ان کی شہرت کا بڑا سبب بنے۔

لکھا گیا ہوں کس کے مقدر کے آس پاس
اِک عمر سے ہوں گنبدِ بے در کے آس پاس

وحشت نئے خیال سے کچھ اس قدر کہ آج
رقصاں ہے ایک تیشہ ہر اِک سر کے آس پاس

تعبیر کی تلاش میں کاسہ بکف ملے
کچھ سر بریدہ خواب قلندر کے آس پاس

ایسی بھی کوئی لہر جو اُس سے ملا سکے
تنہا بھٹک رہا ہوں سمندر کے آس پاس

ایسے سُبو کہ رندوں کی قسمت کہیں جنھیں
ٹوٹے پڑے ہیں چشمِ فسوں گر کے آس پاس

پھولوں میں ورنہ ایسی کبھی دل کشی نہ تھی
ہوگا ضرور کوئی گلِ تر کے آس پاس

کچھ دن سے دیکھتا ہوں میں بچّوں کو غور سے
منڈلا رہی ہو جیسے قضا گھر کے آس پاس

تم جس کو مجھ میں ڈھونڈنے آئے ہو وہ اُمید
ہوگا کسی حسین سے منظر کے آس پاس

○

اپنی فضا سے اپنے زمانوں سے کٹ گیا
پتھر خدا بنا تو چٹانوں سے کٹ گیا

پھینکا تھکن نے جال تو کیوں کر کٹے گی رات
دن تو بلندیوں میں اُڑانوں سے کٹ گیا

وہ سر کہ جس میں عشق کا سودا تھا کل تلک
اب سوچتا ہوں کیا مرے شانوں سے کٹ گیا

پھرتے ہیں پھن اُٹھائے ہُوئے اب ہوس کے ناگ
شاید زمیں کا ربط خزانوں سے کٹ گیا

ڈوبا ہُوا مِلا ہے مکینوں کے خون میں
وہ راستہ جو اپنے مکانوں سے کٹ گیا

مِل کر جُدا ہُوا تھا کوئی اور اس کے بعد
ہر ایک لمحہ اپنے زمانوں سے کٹ گیا

اپنی زُلفیں کیوں سرِ بالیں پریشاں کر چلے
آپ تو بالکل مرے مرنے کا ساماں کر چلے

دیکھ اے صیّاد چھینٹے خوں کے ہر تیلی پہ ہیں
ہم ترے کنجِ قفس کو بھی گلستاں کر چلے

دِل میں ہم شرما رہے ہیں شکوۂ محشر کے بعد
پیشِ حق کیوں آئے کیوں ان کو پشیماں کر چلے

اے چمن والو! جنوں والوں کی عظمت دیکھ لی
اِن گلوں کو واقفِ چاکِ گریباں کر چلے

اپنے دیوانوں کو تم رو کو بہاریں آگئیں
اب کنارہ بابِ زنداں سے نگہباں کر چلے

اے قمر حالِ شبِ فرقت نہ ہم سے چھپ سکا
داغِ دِل سارے زمانے میں نمایاں کر چلے

سرشار صدیقی

ہماری یہ دنیا ہمیشہ محوِ سفر ہے۔ کسی کو کہیں قرار نہیں۔ گردش اور مسلسل حرکت ہر وجود کے لئے لازمی ہے۔ زندگی کی شیرینی مفقود ہے تلخ حقائق ہیں اور ہم۔ یہ باتیں سرشار صدیقی کے کلام میں بھرپور انداز سے پائی جاتی ہیں۔ وہ بہر لمحہ ہوشیار رہتے ہیں اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینا ان کا فنکارانہ شعار ہے۔

سرشار صدیقی نے پابند شاعری کے ساتھ ساتھ آزاد نظمیں بھی خوب لکھی ہیں۔ جس طرح پابند شاعری میں ان کا مخصوص مزاج ہے اسی طرح آزاد شاعری میں بھی ان کا اپنا ایک انداز ہے۔ مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ نعتِ رسولِ کریم بھی والہانہ انداز سے کہتے ہیں۔ سرشار صدیقی کو اللہ تعالیٰ نے ایسا انداز عطا فرمایا ہے کہ وہ اپنے نظریات کا ابلاغ بطریقِ احسن کرتے ہیں۔

برزخ

حسین فردا کی آرزو میں
مرا یقیں
کب سے زندگی کی صلیب پر
انتظار کی گرد ہو چکا ہے
یہ شعلۂ اعتبار
فانوسِ زیست میں
سرد ہو چکا ہے

مرے خدا!
دل کی سرزمیں پر
کوئی مسیحا اتار
جو قتل گاہِ جاں میں
امید کا معجزہ دکھائے

نہیں تو اے آسمان والے
زمیں سے جس طرح تو نے
ساری مسرّتوں کو
صداقتوں کو اُٹھا لیا ہے
مرے یقیں کی یہ بے کفن لاش بھی اُٹھا لے

اب ایسی شہرتِ رسوائی کی ہوس بھی نہیں
کہ ناشناس، مرا حرفِ آشنا کہلائے

وہ دوست ہو کے بھی مخلص ہے کون مانے گا
کہ اس زمانے میں یہ بات معجزہ کہلائے

نیاز مندوں میں کیوں جراتِ سوال نہیں
یہ بے نیازی تو اس شخص کی ادا کہلائے

یہ راز تیرے سوا اور کون سمجھے گا
مرا سکوت ہی اظہارِ مدعا کہلائے

ہمارا جیسا کوئی بادہ خوار کیا ہو گا
کہ ساری عمر پیے اور پارسا کہلائے

اگر بہار پہ ایماں ہو اہلِ گلشن کا
خزاں بھی موسمِ گل ہی کا سلسلہ کہلائے

ہم اب تک اپنے براہیم کی تلاش میں ہیں
جو راہزن بھی یہاں آئے رہنما کہلائے

بہا کے اشک، کچھ اس طرح آنکھ خشک ہوئی
کہ جیسے ابر چھٹا اور چاندنی چھٹکی

میں گھر سے بھاگ کے جاتا بھی تو کدھر جاتا
کہ گھر میں آگ تو باہر کی آگ ہی سے لگی

سراب ہی سے نہ سیراب ہو گئے ہوتے
مگر کسے تھا شعورِ خلوصِ تشنہ لبی

صلائے عام تھی مقتل میں سرفروشوں کو
مگر یہ خوش خبری مجھ کو دیر سے پہنچی

وہ بازگشتِ شکستِ صدائے دل ہی نہ ہو
کہ اس کے بعد وہ آواز پھر سنائی نہ دی

جون ایلیا

جون ایلیا مشرقی زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں. کلاسیکی ادب اور جدید ادب کے گہرے مطالعہ کے سبب ان کی شاعری قدیم و جدید کا عمدہ امتزاج لئے ہوئے ہے۔ وہ جذبے کو خیال پر زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو فطری شاعر ہیں اور دوسری طرف کثیر المطالعہ ہیں اس لئے ان کی شاعری میں کمال درجہ اثر آفرینی پائی جاتی ہے غم جاناں اور غم دوراں دونوں کو گلے لگائے ہوئے ہیں۔ شدتِ احساس اور فراوانیٔ جذبات سے ان کی شاعری میں سوز و گداز اور رنگینی نمایاں طور پر پائی ہے۔ اگرچہ انہوں نے عمدہ نظمیں بھی کہی ہیں مگر ان کی غزلوں میں نظموں کے مقابلہ میں زیادہ دلکشی اور جان سوزی پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ واقعی خونِ جگر کے مرحلے سے گزرتے ہوئے تخلیق کو پیش کرنے کے قائل ہیں۔ وہ بے جا ایمائیت اور اشاریت کے قائل نظر نہیں آتے بلکہ ان کے کلام میں صاف گوئی اور بے باکی پائی جاتی ہے۔ ان کا لب و لہجہ بھی اپنے معاصرین سے مختلف ہے جو ان کے لئے وجہِ امتیاز ہے۔

مثالیے کی تلاش

مثنوی

اے غزال ختن زمینِ غزل — غزلِ غمزہ آفرینِ غزل۔
اے سرخیلِ طرّہ آویزاں — فتنۂ شہرِ شور انگیزاں
اے نوا بخشِ بے نوائی ہا — دولتِ داستاں سرائی ہا
اے بہ منظر، نظر نظر پنہاں — اے بہ معنی، تمام تر عریاں
اے بامکانِ خوشخرامی ہا — سلسبیلِ شکستہ جامی ہا
اے وہ اندازِ جو بیاں میں نہیں — اے وہ محمل جو کارواں میں نہیں

قطعہ

میں نے ان پتھروں کے شہروں میں — مدتوں کا بربت تراش کیا
وقت کی سنگلاخ دری میں — میں نے تجھ کو بہت تلاش کیا

غزل

ہجر کے ساتھ یا وصال کیسا تھا — خوب گزری ترے خیال کیساتھ
میں نے اک زندگی بسر کر دی — تجھے نادیدہ خدوخال کیساتھ
ہر قدم جستجو کی راہوں میں — تھے نئے زخمِ اندمال کیساتھ
ہائے وہ وقفہ طلب مہ و سال — کیفِ مستی بھی تھا ملال کیساتھ
اپنے خوابوں کے ماہ و سال سے میں — گزرا یا ہوں ماہ و سال کیساتھ

غزلیہ

اپنی زادِ سفر گنوائے ہوئے
ساز و برگِ طلب لٹائے ہوئے

اپنی نیرنگ جو طبیعت سے
عاجزانہ شکست کھائے ہوئے

میں دکھے دل کیساتھ لوٹا ہوں
خود بھی کتنے ہی دل دکھائے ہوئے

م۔

آزمائے رفاقتوں کے فریب
کھائے تیری شباہتوں کے فریب

شوق کو رنگ رنگ توڑ دیئے
بت بنائے بنا کے توڑ دیئے

میں نے نکہت کو رنگ پوش کیا
رنگ کو زمزمہ فروش کیا

آگ سے اوس کو چھپایا میں نے
تارِ مہ سے کتاں بنایا میں نے

کچھ نہ تھا شوقِ نادرہ طلبی
جز تلاش و تکان و تشنہ لبی

سفر انگیز مرحلے کب تک
ولولے خوب ہیں پہ ولے کب تک

بے در و بست ہو گیا ہوں میں
تھک کے اب پست ہو گیا ہوں میں

ہر نفس تازہ جوش تھا جب تو
پر بہت دن گزر گئے اب تو

خواب پرور خیالیہ نہ ملا
مجھ کو میرا مثالیہ نہ ملا

دیکھ آیا ہوں پیچ و خم سارے
پر کہیں منزل نہ مل سکی بارے

غزل

یاسمینا! تو کس چمن سے ہے
شمعِ جاں! تو کس انجمن سے ہے

تیرا خیمہ کہاں ہے اے سلمیٰ
اے غزالہ تو کس ختن سے ہے

تجھکو ڈھونڈا ترا مکاں نہ ملا
تو مری روح کس بدن سے ہے

میری بلقیس کا سبا ہے کہاں
میرا طنطنہ کس وطن سے ہے

نہیں کھلتا کہ تیرا سترِ جمال
کس سراپردۂ سخن سے ہے

آسرے بے ستوں کر شیریں کو
کوئی نسبت تو کوہکن سے ہے

اک عجب کچھ لگاؤ ہے تجھ سے
یہ لگاؤ بڑی لگن سے ہے

م

جب کسی دل میں گھر کیا میں نے　　اپنے اندر سفر کیا میں نے
جب کسی پر نگاہ کی میں نے　　اپنے اندر پناہ لی میں نے
جب تعین کو یک نظر دیکھا　　ذات میں اپنی ڈوب کر دیکھا
دل کے عکسِ جمال کو ڈھونڈا　　میں نے اپنی مثال کو ڈھونڈا
رشتۂ ذات کو رفو نا چاہا　　دو نمائی کو یک نما چاہا
اے سراپا خیال کی صورت　　صورتِ بے مثال کی صورت
تو سرا مزروح بھی سو بھی　　تجھ سے باہر بھی سیر کی ہوتی
دید کی راہ سے گزرنا تھا　　کوئی دم تو خرام کرنا تھا

اے ملامت گروں کی رسوائی　　کیوں ہے دربندِ خلوت آرائی
میں نے تیری علامتوں کو سہا
تیرے امکاں سے داد خواہ رہا
میں نے تیری شباہتوں سے کہا
کچھ خیالِ مزاج بھی کیجیو　　غم دیا ہے علاج بھی کیجیو
غم مرا اگرچہ بے علاج نہ تھا　　پر کوئی واقفِ مزاج نہ تھا
ہر خوشی صرفِ اشک شوئی تھی　　راست گوئی دروغ گوئی تھی
ہر یقیں تھا فقط گماں کا حساب　　میرا ہر سود تھا زیاں کا حساب
تھا ہر اندازِ جلوہ آرائی　　میرے ذوقِ نظر کی رسوائی
جب بھی غنچے کھلائے ہیں میں نے　　صرف کانٹے چبائے ہیں میں نے

قطعہ

اعتبارِ نمودِ منزل سے — جادہ پیمائیاں ملیں مجھ کو
جب بھی پہنچی ترے خیال کی دھوپ — صرف پرچھائیاں ملیں مجھ کو

م۔

زندگی ہے کہ شوقِ بے تمکیں — اُسکو آواز دو جو گھر میں نہیں
اے محبت کی منزلِ مقصود — میں ہوں موجود تو ہے ناموجود
سامعہ میں تری نہیں بھی نہیں — کیا ستم ہے کہ تو کہیں بھی نہیں
دل ہمہ داغ ہے جگر خوں ہے — تو نہیں سا ہے تو ذہن میں کیوں ہے
دل ہے بیدل نشیں تو کچھ بھی نہیں — دل و جاں تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
وہم کے پیچ و خم میں کوشاں ہوں — کیا میں اپنے عدم میں کوشاں ہوں
سرِ جاناں سہی تو ہوں میں بھی — جوہرِ جاں سہی تو ہوں میں بھی
عالم آشوبِ آرزو! فریاد — میں ہوا جا رہا ہوں بے بنیاد

سرِ جاناں نہیں تو میں بھی نہیں
جوہرِ جاں نہیں تو میں بھی نہیں

قمر جمیل

عصرِ حاضر میں شاعری نئی نئی ہیئتوں میں نظر آتی ہے۔ قمر جمیل جدید شعراء کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے نثری نظم کے فروغ میں انتھک کوششیں کیں یہ الگ بات کہ قمر جمیل اور ان کے دیگر ساتھیوں کی اس کاوش کو بہت سے اہلِ فن نے پسند نہیں کیا۔ بہر حال نثری نظم کے حوالے سے دبستان کراچی میں قمر جمیل کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے انہوں نے آزاد نظمیں بھی خوب کہی ہیں اور پابند شاعری میں بھی ان کو مہارت حاصل ہے۔ ان کی غزلوں میں جدید موضوعات بکثرت ملتے ہیں اور انداز بھی شگفتہ ہے گویا عمدہ غزل کہنے والا نثری نظم میں اپنا نام پیدا کر گیا۔ قمر جمیل کے ہاں طبقاتی کشمکش، معاشرتی ناہمواری اور سرمایہ داروں کے استحصال سے متعلق جو مضامین پیش کئے گئے ہیں ان میں ایسی اثر آفرینی ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔

مے کدے میں جو کوئی جام بدل جاتا ہے!
عالمِ گردشِ ایام بدل جاتا ہے

شامِ فرقت وہ قیامت ہے کہ اللہ بچائے
صبح کو آدمی کا نام بدل جاتا ہے!

ہم اُسے پہلی محبت کی نظر کہتے ہیں
جس کے آغاز کا انجام بدل جاتا ہے

نامہ بر اُن کی زباں کے تو یہ الفاظ نہیں
راستے میں کہیں پیغام بدل جاتا ہے!

خواب میں رُخ پہ جب آجاتے ہیں اُن کے گیسو
انتظامِ سحر و شام بدل جاتا ہے

تم جواں ہو کے وہی غنچہ دہن ہو یہ کیا
جب کلی کھلتی ہے تو نام بدل جاتا ہے

اے قمر ہجر کی شب کاٹ تو لیتا ہوں مگر
رنگ چہرے کا سرِ شام بدل جاتا ہے

حمد

میری آنکھیں میری جاں
تیرا عبادت خانہ
اور اپنے لئے اک نازِ جحیم
میرا دل ہرنوں کے لئے
میدانِ عظیم
اور اپنے لئے اک خانۂ بیم
میرا دل تو رات کی شان
میرا دل قرآنِ کریم
میں نے اپنی مٹی اپنا پانی
اپنا خون نہ سمجھا اپنا خون
دیکھ یہ دیوانہ شخص!
جس کے لئے لایا ہے کوئی
ایک وصالِ دوام
ایک چراغِ یقین۔

طاؤس اور آنکھ

آئینے سے گھر کی یہ ظلمت نہیں جاتی
ہاں میری طرح یوں تو نکل آتے ہیں کچھ پھول
شاخوں سے مگر اِن کی سیاست نہیں جاتی

ان نیند بھری آنکھوں کی غفلت نہیں جاتی
طاؤس کی مانند نظر آتی ہے دُنیا
پھر بھی میرے ویرانے کی رنگت نہیں جاتی

ہم سے بھی ایک شکوۂ مبہم کرے گی رات
تجھ سے بچھڑ کے آگ پہ ماتم کرے گی رات

جب داستاں الم کی سُنائیں گے قصّہ گو
کچھ اہلِ دل ہیں جن کا بہت غم کرے گی رات

اس دامنِ بہار کا پرچم بنائے گی
اور خود ہی تار تار یہ پرچم کرے گی رات

جب اس جنوں کے داغ سے شمعیں جلائے گی
اک رقص اور بھی تہِ شبنم کرے گی رات

مَیں جہاں ہوں ایک دریا صبر سے لبریز ہے
اور اس دَریا کے آگے ہجر آفت خیز ہے

رات کے ہنگام نِکلے کچھ ستارے اس طرح
جیسے ان کے ہاتھ میں اک شام دلآویز ہے

اس نے چُپکے سے کہا اے میری جاں آہستہ بول
میرے گھر میں ایک بچہ اور آفت خیز ہے

صبح کا مزدور، دن کا آسماں، شب کا گداز
اور چاروں سمت اک بستی الم انگیز ہے

شہر ہے ویرانیاں ہیں اور سمندر کے قریب
ایسے لگتا ہے ہماری گفتگو کی میز ہے

خانۂ حیرت تماشا لے گیا
یہ نہنگِ تشنہ دریا لے گیا

پر شکستہ نود میدہ گئے
بلبل و گل تو وہ لڑکا لے گیا

دیکھ جنگل میں مرا طاؤسِ جاں
شہر کی ہر فکرِ فردا لے گیا

اتنی گرمی ہے کہ بلبل کی صدا
میرے گھر کا ایک شعلہ لے گیا

محسن بھوپالی

نظمانے کے حوالے سے محسن بھوپالی کو خاصی شہرت حاصل ہوئی انہوں نے نئے تجربات اور نئی جہتوں کو برتا اور پرکھا۔ غزل اگرچہ مناسب کہتے ہیں مگر بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں زیادہ اثر اور جذب ہوتا ہے۔ ذہنی طور پر شاعری سے قابلِ ذکر ہم آہنگی ہے اور نئے خیال کی تلاش میں رہنا بھی ان کا خوشگوار مشغلہ ہے۔ محسن کے کئی مجموعے آچکے ہیں۔ انہوں نے ہائیکو بھی عمدہ کہے ہیں۔ خوش مذاقی اور ادب سے دلچسپی ان کا شعار ہے۔ انہیں اس بات کا احساس رہتا ہے کہ بحیثیت شاعر انہیں نہ صرف حالات کی تصویر کشی کرنی ہے بلکہ ان کی تخلیق میں اس سے بڑھ کر تجزیہ اور محاکمہ بھی ملتا ہے۔

وہ شرر ہے کہ ستارا ہے کہ جگنو، کیا ہے
اس سے مل کر یہ یقیں آیا کہ جادو، کیا ہے

کشتِ ویراں کو عطا کر کے نئی رُت کی نوید
اس نے احساس دیا لمس کی خوشبو کیا ہے

اس کو دیکھا جو نظر بھر کے تو عرفان ہوا
عشق کہتے ہیں کسے، نعرۂ یا ہو کیا ہے

اِس سے منسوب ہُوئے لفظ تو معنی بھی کھُلے
رنگ کہتے ہیں کسے موجۂ خوشبو کیا ہے

ایک مدّت میں جو بچھڑا ہے تو احساس ہوا
کیا ہے ماتھے کی شکن، جنبشِ ابرو کیا ہے

ایک مدّت کی سُلگتی ہوئی تنہائی نہ ہو
وہ لرزتا ہوا سایہ سالبِ جو کیا ہے

شاخ در شاخ رقم ہے مری روداد سفر
اور شجر پوچھتا ہے ربطِ من و تو کیا ہے

اس کے حلقے سے نکلنا نہ تھا آسان محسن
بچ نہ سکتے ہوں فرشتے بھی جہاں بھی تو کیا ہے

بے خبر سا تھا مگر سب کی خبر رکھتا تھا
چاہے جانے کے سبھی عیب و ہنر رکھتا تھا

لاتعلق نظر آتا تھا بظاہر لیکن
بے نیازانہ ہر اک دل میں گزر رکھتا تھا

اس کی نفرت کا بھی معیار جدا تھا سب سے
وہ الگ اپنا اک انداز نظر رکھتا تھا

بے یقینی کی فضاؤں میں بھی تھا حوصلہ مند
شب نژادوں سے بھی امید سحر رکھتا تھا

مشورے کرتے ہیں جو گھر کو سجانے کے لئے
ان سے کس طرح کہوں میں بھی تو گھر رکھتا تھا

اس کے ہر وار کو سہتا رہا ہنس کر محسن
یہ تاثر نہ دیا میں بھی سپر رکھتا تھا

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

افتخار عارف

دبستان کراچی کے ذہین اور معروف شاعر افتخار عارف کی شاعری جدید خطوط پر استوار ہے۔ انہوں نے جس طرح پابند شاعری میں اپنے فن کا کمال دکھلایا ہے اسی طرح آزاد شاعری میں سخن آرا ہوئے ہیں۔ ان کے لب و لہجہ کی تازگی اور طرزِ ادا کا بانکپن قابلِ توجہ ہے۔ مختلف ہیئتوں سے متعلق ان کا گہرا مطالعہ ہے۔ اور خود بھی ان ہئتوں کو برتنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری جس میں مضمون کی ندرت اور اسلوب کی دلکشی کے سبب ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ وہ شاعرِ احساس ہیں۔ ان کے کلام میں نفسیاتی اور عمرانی تجزیاتی انداز پایا جاتا ہے جس کا سبب ان کا فنکارانہ قامت بلند نظر آتا ہے۔ افتخار عارف کو غزل اور نظم دونوں صنفوں پر یکساں قدرت حاصل ہے وہ ایک شاعرِ پختہ کار کی حیثیت سے اہلِ نظر کی نگاہوں میں معتبر مانے جاتے ہیں۔

المیہ

سنا تو یہ تھا ہوا کے ہاتھوں یہ بیعتِ خاک کرنے والے نہیں رہیں گے

پڑھا تو یہ تھا زمین عنبر پہ کشتِ خاشاک کرنے والے نہیں رہیں گے

مگر ہوا یوں نیزۂ شام پر سرِ آفتاب آیا

امانتِ نور جس کے ہاتھوں میں تھی اسی پر عذاب آیا

اور مرے کم حلیف و کم آبرو قبیلے کے لوگ مجھ سے یہ

پوچھتے ہیں

ہماری قبریں کہاں بنیں گی ؟

ہمیں خبر ہے کہ وقت کے بے لحاظ و بے اعتبار لشکر

تمام سمتوں سے آ رہے ہیں

چک پھیری

بچپن کی گلیوں میں جن جن گھروں کے شیشے میری گیند سے ٹوٹے۔
ان سب کی کرچیں کبھی کبھی مری آنکھوں میں چبھنے لگتی ہیں
جلتی دوپہروں میں میرے ہاتھوں اُجڑے ہوئے
گھونسلوں کے بے حال پرندوں کی چیخیں فریادیں
میری بے گھر شاموں میں کہرام مچاتی رہتی ہیں
چکنا چُور دنوں
ریزہ ریزہ راتوں میں
سوئے ہوئے سب خواب جگاتی رہتی ہیں
پھر اپنے خنجر اپنے ہی سینوں میں اُترنے لگتے ہیں
اور زندہ چہرے جیتے بجھتے لمحوں کی آغوش میں مرنے۔

نسیم امروہوی

مولانا سید قائم رضا تقوی نسیم امروہوی ایک جید عالم اور ماہر لسانیات تھے۔ لغات کے حوالے سے جوش ملیح آبادی کی طرح انہیں بھی سند تسلیم کیا جاتا ہے۔ فلسفہ، عربی فارسی، ہندی اور اردو ادب پر انہیں دسترس حاصل تھی۔ اسلامی تاریخ سے بھی گہرا لگاؤ جس کا عکس ان کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے۔ وہ علم عروض کے ماہر تھے اور ان کی قادر الکلامی کا اعتراف ہر اہل علم پر فرض ہے۔ انہوں نے حمد و نعت منقبت پر مشتمل ایک ذخیرہ چھوڑا ہے۔ قصیدہ نگاری میں بھی انہوں نے اپنی فکر کے جوہر دکھلائے ہیں۔ مرثیہ نگاری کی حیثیت سے انہیں عظمت دوام حاصل ہے۔ انہوں نے موضوعاتی مرثیے کثیر تعداد میں کہے جن میں عصری تقاضوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ نسیم امروہوی کلاسیکی مرثیہ گوئی میں طاق تھے۔ وہ اپنے فکر و فن کے حوالے سے ہر دور میں زندہ رہیں گے۔

پروین شاکر

پروین شاکر عہد حاضر کی معروف و مقبول شاعرہ ہیں اور انہوں نے بہت جلدی اتنی شہرت حاصل کی اس کا سبب ان کا شاعری سے فطری لگاؤ ہے وہ فطری شاعرہ بھی ہیں اور فکر بھی اعلیٰ رکھتی ہیں اس لئے انہیں معاصرین میں امتیاز حاصل ہے۔ ان کی غزلوں میں حیات و کائنات کی وسعتیں سمائی ہوئی ہیں اور محبت کے لطیف و نازک جذبات کے سبب ان کا کلام ایک مہکتا ہوا گلستاں ہے جس میں محبت کے متنوع پھول کھل رہے ہیں۔ لب و لہجہ کی انفرادیت اور شائستگی نے پروین شاکر کو یہ مقام عطا کیا ہے۔ داخلی کیفیات کا دلکش اور اثر آفریں انداز ان کے شاعرانہ حسن کو نکھارے ہوئے ہے۔ وہ خارجی عوامل کا تذکرہ بھی تیکھے انداز میں کرتی ہیں۔ جدید فنکاروں میں انہیں اپنے اسلوب کی وجہ سے جو مقبولیت حاصل ہے اس کا تذکرہ بھی نہایت ضروری ہے۔

شاید اس نے مجھ کو تنہا دیکھ لیا ہے
دُکھ نے میرے گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے

اب میرے میدانوں کو اللہ ہی رکھے
کہساری دُشمن نے، دریا دیکھ لیا ہے

اپنے آپ سے آنکھ چُرائے پھرتی ہوں
آئینے میں کس کا چہرہ دیکھ لیا ہے

اب بھی سینے بوے تو ایمان اُس کا
اُس نے ان آنکھوں میں صحرا دیکھ لیا ہے

اُس نے مجھے دراصل کبھی چاہا ہی نہیں
خود کو دے کے یہ بھی دھوکہ دیکھ لیا ہے

اُس سے ملتے وقت کا رونا فطری تھا
اُس سے بچھڑ جانے کا نتیجہ دیکھ لیا ہے

رُخصت کرنے آداب نبھانے تھے
بند آنکھوں سے اُس کو جاتا دیکھ لیا ہے

○

کچھ توقع ہی نہیں شاخِ ثمر کے ہمراہ
غیر مشروط محبت ہو شجر کے ہمراہ

ایسا لگتا ہے کہ پیروں سے لپٹ آئی ہے
ایک زنجیر بھی اسبابِ سفر کے ہمراہ

اتنا مشکل تو نہیں میرا پلٹنا لیکن
یاد آجاتے ہیں رستے بھی تو گھر کے ہمراہ

کس سے تصدیق کروں شہر کی بربادی کی
اب تو قاصد بھی نہیں ہوتے خبر کے ہمراہ

اتنا آسان نہیں کام رفوگر میرے
زخم کچھ اور بھی ہیں زخمِ جگر کے ہمراہ

میں نے جنگل میں کبھی پیچھے نہیں مڑ کر دیکھا
کیا عجب عزم بندھا رختِ سفر کے ہمراہ

مرثیہ

شہادت حضرت عبّاسؑ علیہ السّلام

مشک بھر کر سوئے خیمہ جو علمدار چلے　روکنے کے لیے رستہ ستم اطوار چلے
یہ بسرعت جو اُڑاتے ہوئے رہوار چلے　تیر برساتے ہوئے لاکھ ستمگار چلے
اب لڑیں یا عَلم و مشک سنبھالیں عبّاسؑ
باگ لیں گھوڑے کی یا تیر نکالیں عبّاسؑ

تیر دلدوز کلیجے کو ہلاتے ہی رہے　آپ شانِ اسداللہ دکھاتے ہی رہے
رَن ہلاتے ہی رہے حشر اٹھاتے ہی رہے　تیر خود کھائے مگر مشک بچاتے ہی رہے
کوئی پہلو پہ لیا کوئی جگر پر روکا
زد پہ مشک آئی تو کی سپر پر روکا

سپہِ شام اُمڈتی تھی جو مانندِ بلا　دمبدم نادِ علیؑ پڑھتا تھا یہ جانِ وفا
دل سکینہؑ میں، نظر فوج پہ، ہونٹوں پہ دعا　خلد سے فاطمہ زہراؑ کی یہ آتی تھی صدا
میرے مظلوم کی خاطر جد و کد کرتے ہو
امّاں صدقے مرے بیکس کی مدد کرتے ہو

لاکھ روباہوں نے روکا، پہ غضنفر نہ رکا | تیر برسے، پہ جگر گوشۂ حیدرؑ نہ رُکا
مِل کے سب ٹوٹ پڑے، پھر بھی دلاور نہ رُکا | کٹ گئے ہاتھ، مگر شہ کا برادر نہ رُکا

پھٹ کے گیتی پہ نہ کیوں گنبدِ دوّار گِرا
لو زمیں پر علمِ احمدؐ مختار گِرا

ہائے لاکھوں وہ شقی اور وہ تنہا جرّار | اے دلافگار کے سقّے تری جرأت کے نثار
اس طرح مشک کو دانتوں میں دبایا اکبار | جس طرح شیرِ غضبناک کے منہ میں ہو شکار

وار پڑتے ہیں تو یہ سر کو جُھکا لیتے ہیں
مشک کو سینۂ زخمی سے چھپا لیتے ہیں

دل ہی کہتے ہیں کہ یا حیدرؑ صفدر آ جاؤ | بچّی مر جائے گی مشکیزہ کو تیروں سے بچاؤ
کبھی فرماتے ہیں اے شامیو یہ قہر نہ ڈھاؤ | سر مرا کاٹ لو پر مشک کو ناوک نہ لگاؤ

قتل کے بعد بھی عبّاسؑ کو ایذا دینا
پر سکینہؑ کی امانت اُسے پہنچا دینا

تھے اسی طرح سوئے خیمۂ شبّیرؑ رواں | یک بیک چشمِ مبارک میں گڑا اک پیکاں
تیر کھا کر ابھی سنبھلا بھی نہ تھا شیرِ ژیاں | ناگہاں مشک چِھدی، سر پہ لگا گرزِ گراں

خون بہتا رہا جب تک تو نہ زنہار گرے
بہ گیا آب، تو ریتی پہ علمدار گرے

منہ سے بے ساختہ نکلی یہ غم انگیز صدا | السّلام اے جگر و جانِ بتولِ عذرا
السّلام اے پسرِ بادشہِ عقدہ کشا | السّلام اے ثمرِ باغِ رسولِ دوسرا

چھوڑ کر سیّدِ والا کے قدم جاتے ہیں
اب سکینہؑ سے خبردار کہ ہم جاتے ہیں

یہ صدا سنتے ہی مولا نے جگر کو تھاما | ضعفِ پیری نے شہِ جن و بشر کو تھاما
غش جو آیا، علی اکبرؑ نے پدر کو تھاما | درد نے اُٹھ کے مسافر کی کمر کو تھاما

رو کے فرمایا اَخی تم بھی مجھے چھوڑ چلے
ہائے پردیس میں بیکس کی کمر توڑ چلے

کہہ کے یہ اشک بہاتے ہوئے دریا کو چلے | راہ میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے دریا کو چلے
داغ پر داغ اٹھاتے ہوئے دریا کو چلے | وہ کٹے ہاتھ بھی پاتے ہوئے دریا کو چلے

ساتھ میں اکبرِ ناشاد بھی غم کھاتے تھے
دم بدم ہائے چچا کہہ کے تڑپ جاتے تھے

نوحۂ وا اَسفا پڑھتے ہوئے شاہِ اُمم | لاش پر پہنچے تو یہ دیکھا عجب منظرِ غم
بل نہ چہرے پہ، نہ ماتھے پہ ہیں آثارِ الم | اک طرف مشکِ سکینہ ہے تو اک سمت علم

شان پر دیکھنے والوں کو گماں ہوتا ہے
گھاٹ روکے ہوئے بے خوف سدا سوتا ہے

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب کا نام	دبستانِ کراچی کے ممتاز شعراء
مصنف	نعیم الحق صبا ضیائی
کتابت	حبیب عالم
سالِ اشاعت	۱۹۹۰ء
اشاعت اوّل	ایک ہزار
قیمت	۳۵ روپے

ناشر

بزمِ شعور و دانش۔ کراچی

رو کے بولے مرے پیارے تری شوکت کے نثار | میرے جانباز اخی میں تری جرأت کے نثار
میری نادان کے سقّے تری ہمّت کے نثار | اے مرے چاہنے والے تری چاہت کے نثار

راحتِ جانِ رسولِ الثقلین آیا ہے
اٹھو بھائی تمھیں لینے کو حسینؑ آیا ہے

اے مرے قوّتِ بازو، مرے بابا کے نشاں | ابھی زندہ ہو کہ جنّت میں گئے بھائی جاں
سُن کے یہ ہوش جو آیا تو کہا میں قرباں | عبدِ ناچیز کی تسلیم، امامِ دو جہاں

نہر پر آنے کی تکلیف جو فرمائی ہے
آپ کے ساتھ سکینہؑ تو نہیں آئی ہے

بولے شبیرؑ وہ ڈیوڑھی پہ کھڑی روتی ہے | آپ کی یاد میں بیتاب ہے جاں کھوتی ہے
دم بدم پیاس کی ایذا جو سوا ہوتی ہے | نہر کو تکتی ہے اور اشکوں سے منہ دھوتی ہے

بولے عبّاسؑ کہ خادم پہ ترس کھائیے گا
اب مری لاش کو خیمے میں نہ لے جائیے گا

شہ نے آنسو جو بہائے یہ وصیت سنکر | شدّتِ غم سے جگر تھام کے روئے اکبرؑ
بولے شبیرؑ کہ اے نورِ نگاہِ حیدرؑ | خاتمہ تجھ پہ وفا کا ہے مرے رشکِ قمر

کہہ کے یہ لاشِ برادر کے قریں بیٹھ گئے
گود میں بھائی کا سر رکھ کے وہیں بیٹھ گئے

تیر پہلی سے جُدا کر کے بصد آہ و بُکا | خون چہرے کا محمدؐ کی قبا سے پونچھا
ناگہاں شیر کی آنکھوں پہ نظر کی تو کھُلا | کوئی صدمہ ہے کہ روتے ہیں کہا بھائی یہ کیا
کیا یتیموں کے لیے محوِ قلق ہوتے ہو
بھائی عبّاسؑ کہو تو سہی کیوں روتے ہو

عرض کی اور ہی کچھ فکر ہے اے ابرِ کرم | اپنے بچّوں کا نہ کچھ دھیان نہ صدمہ نہ الم
بس اگر ہے تو غمِ سیّدِ مظلوم کا غم | وقتِ آخر کا مجھے دھیان ہے، اے شاہِ اُمم
مرتے دم بھی تو وہ صدمہ مجھے تڑپاتا ہے
کس طرح عرض کروں منہ کو جگر آتا ہے

وہ بزرگوں کا دمِ نزع وہ دنیا سے سفر | وہ نبیؐ اور وہ آغوشِ یداللہ وہ سر
وہ سرِ شیرِ خداؑ اور سرھانے شبّرؑ | وہ تہِ فرقِ حسنؑ زانوے شاہِ بے پر
حیف یاں تو کوئی بھائی نہ بھتیجا ہوگا
ہائے پھر کیا سرِ سرور کا نتیجا ہوگا

شاہِ بیکس نے کہا آہ نہ پوچھو بھیّا | یہ الم یہ غمِ جانکاہ نہ پوچھو بھیّا
کوئی مونس نہ ہوا خواہ، نہ پوچھو بھیّا | میرے انجام کو للّٰلہ نہ پوچھو بھیّا
لب پہ اُمّت کی دُعا، حلق پہ خنجر ہوگا
گود میں فاطمہؑ زہرا کی مرا سر ہوگا

یہ سخن سنتے ہی حیدرؑ کا اسد تھرّایا | غمِ شبیرؑ کے نیزے نے جگر برمایا
منکا ڈھلنے لگا ماتھے پہ پسینہ آیا | سانس نے ٹوٹ کے مظلوم پہ محشر ڈھایا

شہ نے دیکھا تو نہ پھر تن میں حرارت پائی
غُل ہوا نہر پہ سقّے نے شہادت پائی

گر کے لاشے پہ کہا شہؑ نے بصد آہ و فغاں | ہم سے مُنہ موڑ گئے اے شہِ مرداں کے نشاں
عصر کا وقت بھی نزدیک ہے اے راحتِ جاں | اک ذرا اور ٹھہر جاؤ اخی میں قرباں

میری معصوم حزینہ سے تو مِلتے جاؤ
بھائی عبّاسؑ سکینہ سے تو مِلتے جاؤ

شبّرؑ کا ماہ رُو

شبّرؑ کا ماہ رُو تھا جلالت میں لاجواب | ابرو تھے ذوالفقار تو چہرہ تھا آفتاب
بھیگی ہوئی مسیں خبرِ آمدِ شباب | تیرہ برس کے سن میں تھے جیسے ابوترابؑ

بہرِ جہاد صورتِ حیدرؑ تنے ہوئے
جنّت کے اشتیاق میں دولھا بنے ہوئے

سیّد آلِ رضا

جوش، قمر جلالوی اور نیم امروہوی کی طرح سید آلِ رضا دبستانِ کراچی کے ایک ذی علم اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ انہیں فن پر قدرت حاصل تھی اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی انہیں ممتاز مقام حاصل ہوا۔ انہوں نے غزلیں بھی خوب کہیں اور قدیم و جدید کا دلکش امتزاج بھی پیش کیا۔ ان کی غزلوں میں سوز دروں بھی پایا جاتا ہے اور نفسیاتی مسائل بھی اکثر جاذب اثر اسلوب میں محاکمے کے ساتھ ملتے ہیں۔ لکھنویت ان کا مزاج تھا۔ آرزو لکھنوی کے بلند پایہ شاگرد تھے۔ مرثیہ گوئی میں سید آل رضا کو خصوصی طور پر امتیاز حاصل ہے۔ ان کے مرثیوں میں رسائی تنظیم کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضوں کا تجزیہ بھی ملتا ہے۔ کربلا کے حوالے سے انہوں نے زندگی کے مسائل حل کئے ہیں اور ذبیحِ عظیم کی کامیاب تفسیر کی ہے انہوں نے نعت و منقبت اور سلام بھی کہے ہیں۔ ان کا ایک سلام بے حد مشہور ہے اور شامِ غریباں کے بعد نشر کیا جاتا ہے مذکورہ سلام کا پہلا مصرع ہے۔

"سلام خاک نشینوں پہ سوگواروں کا"

تھا جہاں پیشِ نظر واں قرآں کو لے آئے حسینؑ / بچ گئی بات محمدؐ کی، قدریں جائے حسینؑ
مرضیِ حق سے مزیّن تھا جو ایمائے حسینؑ / مشعلِ راہ بنا نقشِ کفِ پائے حسینؑ

اک عجب طرز سے اسلام دوبارہ چمکا
خون میں ڈوب کے ایمان کا تارا چمکا

پھر ہوا آئینۂ سنت و سیرت روشن / پھر نگاہوں میں کھبا خوئے محمدؐ کا چلن
پھر کھلا خسروی طرح حسینِ عقیدت کا چمن / پھر جچا کعبۂ ایماں کا وقارِ مامن

دینِ پناہی کے وہ تیور تھے کہ دل مان گئے
لوگ بگڑی ہوئی تصویر کو پہچان گئے

مذہبی روح تھی اسلام کا اصلی جوہر / اور اسی روح سے زندہ تھا اصل کا پیکر
حاکمیت، دین کی تلوار نہ تھی، بلکہ سپر / ڈھل گیا وار حکومت کی سیاست کا مگر

پھر تو جو مقصدِ اصلی تھا وہ پامال ہوا
دل یہ آخری عہدی قدروں کا بھی جنجال ہوا

کتنا نازک تھا فریضہ، جو بجا لائے حسینؑ / تابہ دل، حلقۂ مذہب کو بڑھا لائے حسینؑ
کلمہ، رسم کے پھندے سے چھڑا لائے حسینؑ / حق کو، ناحق کی ملاوٹ سے بچا لائے حسینؑ

نقل کو، اصلی حقیقت کی جگہ لینے نہ دیا
ڈھونگ اسلامِ مجازی کا پنپنے نہ دیا

حق میں اسلام کے نانا کی تمنا تھے حسینؑ / جو نہیں ڈالی نہ ہو تم، وہ سپر وسا تھے حسینؑ
باپ بھائی کے مقاصد پہ جو چھایا تھے حسینؑ / سلسلہ وار فرائض کا تتمّا تھے حسینؑ

دین و دنیا کی قیادت کو الگ کر کے رہے
بادشاہت سے امامت کو الگ کر کے رہے

جاہلیت کا جو تھا مفسدِ اسلام اثر / سامنے لا کے رہا شکلِ یزیدِ خود سر
اب بنا گردنِ ایماں کے لیے یہ خنجر / آ کے بیعت کرے فاسق کی امامِ اطہر

ذمہ داری امامت نے گوارا نہ کیا
مر مٹے، حق کی حفاظت سے کنارا نہ کیا

رئیس امروہوی

رئیس امروہوی ایک کہنہ مشق اور ماہر فن شاعر تھے برجستگی اور فی البدیہہ گوئی میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مابعد الطبعیات اور نفسیات سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی۔ نجوم و رمل اور علم الاعداد سے بھی وہ گہرا شغف رکھتے تھے۔ تاریخ گوئی کے فن میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی ان کے قطعاتِ تاریخ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ قطعہ نگاری میں انہوں نے سیاسی، عمرانی اور معاشی و اخلاقی موضوعات پر بے تکان لکھا ہے۔ بحیثیت قطعہ نگار انہیں انفرادیت حاصل رہی۔ ان کے قطعات میں پاکستان کی تاریخ محفوظ ہو گئی ہے۔

جناب رئیس امروہوی نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ وہ روایت کے ایک معتبر امین کی حیثیت سے سخن آرائی کرتے رہے البتہ ان کے موضوعات جدید بھی ہوتے تھے تاکہ گرد و پیش کی تصویر کشی کی جائے اور وہ اپنے خیالات کے ابلاغ میں کامیاب رہے۔ رئیس امروہوی کی رحلت سے اردو ادب کو قابلِ ذکر نقصان ہوا۔ وہ عمدہ نثر نگار اور پختہ شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کئے جائینگے۔

آیا وہ مستِ نازکِ خرامی
نذرانہ جس کا جانِ گرامی

لاکھوں سلام اُس جانِ جہاں پر
دونوں جہاں ہیں جس کے سلامی

مقصودِ خلقت، محبوبِ قدرت
اللہ رے اُس کی ذاتِ گرامی

مولا کا بندہ، بندوں کا مولا
اپنوں کا ساتھی، غیروں کا حامی

شاہوں سے برتر درویش اُسکے
شاہی سے بڑھ کر اُس کی غلامی

قرآنِ صامت، فرقانِ ناطق
اوّل پیام اور آخر پیامی

سب اُس کے زیرِ دامانِ رحمت
ترکی و تازی مصری و شامی

اے شاہِ خوباں اے ماہِ خوبی
احساں ہیں تیرے ہم پر دوامی

خاصانِ حق کی نسبت پہ نازاں
تیری بدولت ہم جیسے عامی

اہلِ طلب کا ملجا و ماوا
صرف ایک تیری درگاہِ سامی

ہم تیری ذاتِ والا پہ والہ
ہم تیرے نامِ نامی سے نامی

اللہ رے عزمِ طوفِ مدینہ
اللہ رے اپنی لغزیدہ گامی

نظمِ رئیس اک نذرِ عقیدت
یارب قبولِ طبعِ گرامی!

عہدِ جوانی

اُف کتنا سیمیں اُف کتنا زرّیں اُف کتنا رنگیں عہدِ جوانی
دِن جلوہ پرور راتیں معطّر صبحیں منوّر شامیں سہانی
وہ کیفِ ہستی وہ جوشِ مستی وہ خود پرستی وہ زندگانی
بارِ الم سے احساسِ غم سے خوابوں کی دیوی سنپونکی رانی
کیوں سرگراں ہے کیوں سرگراں ہے
میں بھی جواں ہوں تو بھی جواں ہے

یہ رقص و نغمہ فتنے پہ فتنہ یہ حُسن و جلوہ جادو پہ جادو
یہ زلفِ برہم یہ موئے پُرخم یہ نازِ پیہم یہ چشمِ آہو
یہ قدِّ بالا اے سروِ رعنا! یہ حُسنِ زیبا اے یارِ خوش خو
اے جانِ عالم سحرِ مجسّم ہمرازو ہمدم دلدار و دلجُو
شرمِ تغافل کیوں درمیاں ہے
میں بھی جواں ہوں تو بھی جواں ہے

ہر انقلابِ جہاں، انقلاب زندہ باد
رواں۔ دواں۔ گذراں انقلاب زندہ باد

زمیں پہ نازِ ثباتِ قدم نہ کر اے دوست!
کہ منقلب ہے جہاں انقلاب زندہ باد

یہ عہدِ نو کا تقاضہ ہے اے مؤذنِ صبح
بجائے شورِ اذاں، انقلاب زندہ باد

بڑھے چلو کہ وہ ہے انقلاب کی منزل
جرس ہے نعرہ زناں۔ انقلاب زندہ باد

ابھی نہ چھیڑ دوامِ بہار کے نغمے
کہ ہے خروشِ خزاں انقلاب زندہ باد

طوفاں سے مفر ہے نہ زمیں پر نہ فضا میں
چل بیٹھے خود رہگذرِ سیلِ بلا میں

دم کیوں نہ گھٹے کوہ و بیاباں کی فضا میں
جلتے ہوئے شہروں کی عفونت ہے ہوا میں

یہ آبلہ پا کون رہِ شوق سے گزرا
کیوں خوں کے دھبّے ہیں نشانِ کفِ پا میں

اس رات مہ و کاہکشاں کا ہے یہ عالم
جیسے کوئی زنجیر معلق ہو خلا میں

اُگتے ہیں ہر اک شاخ پہ مرجھائے ہوئے پھول
کیا زہر گھلا ہے نفسِ بادِ صبا میں

منشورِ ہلاکت ہی سہی نوعِ بشر کا
لکھا تو ہو کچھ دفترِ دیوانِ قضا میں

تخریبِ دو عالم کا سبب بن کے رہے گی
وہ جنگ کہ برپا ہے بشر اور خدا میں

اِنتساب

اُستاذُالاساتذہ

پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مدظلہٗ

کے نام

صبا اکبر آبادی

صبا اکبر آبادی کے کلام میں کلاسیکی اسلوب نگارش عصری تقاضوں سے خاصی حد تک ہم آہنگ ہے۔ وہ فنی باریکیوں سے بخوبی آگاہ ہیں جس کے اثرات ان کے کلام میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنے جاذب اثر اسلوب کے ساتھ ساتھ شاعری کے روایتی حسن کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے اظہار میں بے ساختگی اور پختگی پائی جاتی ہے۔ فکری اور فنی اعتبار سے ان کی شاعری میں تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ موجودہ زمانے میں روایتی حسن کو وہ اس معیار سے اپنائے ہوئے ہیں کہ ایسے دو چار افراد ہی نظر آتے ہیں۔ جنہیں ان کا مد مقابل کہا جا سکتا ہے۔ ان کی جمالیاتی حس ان کی غزلوں میں نمایاں ہے اس کے علاوہ حیات و کائنات کے مسائل بھی ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔ بحیثیت مرثیہ نگار انہوں نے جو بلند مقام حاصل کیا ہے اس کا تذکرہ نہایت ضروری ہے ان کا خیال ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر یہ حقیقت ہر اہل نظر پر واضح ہے کہ انہیں مرثیہ نگاری کے سبب زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ ایک اعلیٰ مرثیہ نگار ہیں اور روایتی مرثیے کے تمام اجزا کو بڑی ہی فنکاری سے برتنے میں ماہر ہیں۔

زندگانی کا سب جھمیلا ہے
موت کا راستہ اکیلا ہے

بھیڑ تنہائیوں کا میلا ہے
آدمی کس قدر اکیلا ہے

یہ سمجھ کر کہ یہی منشا تھی
ہم نے ہر غم خوشی سے جھیلا ہے

آؤ تنہا چلیں سوئے منزل
کارواں تو بڑا جھمیلا ہے

انتظامات ہیں خدائی کے
اور میرا خدا اکیلا ہے

دوستو چلتے پھرتے دیکھ بھی لو
زندگی دو گھڑی کا میلا ہے

نگہ ناز بار بار نہ چھیڑ
دل ہمارا نیا نویلا ہے

سوزِ غم دل کو پھونک ڈالے گا
تم نے کس آگ میں ڈھکیلا ہے

اے صبا لفظ وہ کھلونے ہیں
عمر بھر ہم نے جن سے کھیلا ہے

اُجالا کر کے ظلمت میں گھرا ہوں
چراغِ رہگذر تھا، بجھ گیا ہوں

تری تصویر کیسے بن سکے گی
ہر اک سادہ ورق کو دیکھتا ہوں

مجھے طوفان سے شکوہ نہیں ہے
ہلاکِ بے رخیٔ ناخدا ہوں

سبھی کو ادّعائے دوستی ہے
میں اپنے دشمنوں کو دیکھتا ہوں

ترے تیروں کا اندازہ کروں گا
ابھی تو زخم دل کے گِن رہا ہوں

بسا ہے دل میں اک نقشِ خیالی
کسے سمجھاؤں کس کو چاہتا ہوں

تمھیں سو رُخ نظر آئیں گے اپنے
میں آئینہ ہوں اور ٹوٹا ہوا ہوں

صبا آہستہ آہستہ اُڑوں گا
میں دستِ ناز کا رنگِ حنا ہوں

سراج الدین ظفر

سراج الدین ظفر ایک ذی علم شاعر تھے۔ ان کے مخصوص لب ولہجہ جس میں زندی اور تمکنت پایا جاتا ہے قابلِ ذکر ہے۔ سراج الدین ظفر کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ وہ فکری اعتبار سے بھی بلند تھے اور الفاظ و تراکیب کے در وبست میں بھی ان کا اپنا ایک مزاج تھا ایسی انفرادیت بہت ہی کم شاعروں میں پائی جاتی ہے۔ جو اُن کا طرۂ امتیاز رہی۔ معاصرین میں ان کی بالکل جدا آواز تھی۔ سراج الدین ظفر کی شاعری میں لسانی خوبیاں بھی غیر شعوری طور پر در آئی ہیں۔ اشعار میں آورد برائے نام ملتی ہے جبکہ آمد ہی آمد کے سبب ان کے کلام میں روانی پائی جاتی ہے۔ رنگینیٔ جذبات اور لطافتِ مضمون کی مثالیں ان کے کلام میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں دونوں موضوعات کو انہوں نے خوب برتا ہے۔ تغزل میں سرمستی و جذب اور بانکپن اس طرح ملتا ہے کہ قاری پر ایک خاص اثر مرتب ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے ایک بلند شاعر تھے۔ دیگر نامور شعراء کی طرح انہوں نے فکر و فن کے حوالے سے خوب شہرت پائی۔

○

اٹھو زمانے کے آشوب کا ازالہ کریں
بنامِ گُل بدناں رخ سُوئے پیالہ کریں

بیادِ دیدۂ مخمور پر پیالہ کریں
اٹھو کہ زہر کا پھر زہر سے ازالہ کریں

وہ رند ہیں نہ اٹھائیں بہار کا احساں
ورود ہم تری خلوت میں بے حوالہ کریں

کہاں کے دیر و حرم آؤ ایک سجدۂ شوق
بپائے ہوشربایانِ بست سالہ کریں

برس پڑے جو گلستاں میں اس سے شراب
بہک بہک کے ہم آگے سبوئے لالہ کریں

سبو اٹھا کہ گدایانِ کوئے مے خانہ
ترے حوالے مہ و مہر کا قبالہ کریں

حدیثِ زہد ہو یا وارداتِ زہرہ وشاں
کسی کے نام کو ہم زیبِ ہر مقالہ کریں

دکھا صحیفۂ رُخ اس طرح کہ اہلِ بہار!
ورق ورق بخجالت بیاضِ لالہ کریں

اٹھو جلا کے مئے سرخ سے چراغِ ابد
نشاطِ صحبتِ شب کو ہزار سالہ کریں

ادا وہ نیچی نگاہوں کی ہے کہ جیسے ظفر
تلاشِ گنجِ غزالانِ خورد سالہ کریں

○

درِ مے خانہ سے دیوارِ حرم تک پہنچے
ہم غزالوں کے تعاقب میں ختن تک پہنچے

ہاتھ میخواروں کے بے قصد اٹھے تھے لیکن
اتفاقاً ترے گیسو کی شکن تک پہنچے

مدرسے میں کہاں اس زلف کا موضوعِ جدید
لوگ پہنچے تو روایاتِ کہن تک پہنچے

راستہ ایک تھا ہم عشق کے دیوانوں کا
قدِ گیسو سے چلے دار و رسن تک پہنچے

آئیں ہم دست درازی پہ تو میخانے سے
سلسلہ انجمنِ سرو و سمن تک پہنچے

اک قبائے سبک و تنگ میں سو سو ہیں طلسم
کیا کوئی حسن کے اسرارِ کہن تک پہنچے

آپ ہی آپ جو کھل جائے تری زلفِ دراز
ناگہاں بے ہنری نقطۂ فن تک پہنچے

اے سخن فہم ہم اس بزم سے آئے ہیں جہاں
حیرتِ آئنہ اسلوبِ سخن تک پہنچے

اس طرح شوقِ غزالاں میں غزلخواں ہو ظفر
شہرتِ مشکِ غزل شہرِ ختن تک پہنچے

پروفیسر منظور حسین شور

عصر حاضر میں پروفیسر منظور حسین شور جیسی شخصیت کا دم غنیمت ہے۔ شور صاحب مغربی ادبیات اور مشرقی ادبیات پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ ان کا عمیق مطالعہ اور تنقیدی زاویۂ فکر انہیں مقام ارفع عطا کئے ہوئے ہے، ہیگل مارکس اور ہربرٹ اسپنسر کے نظریات سے وہ بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ جدیدیت کے حوالے سے ان کا نام فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کی طرح معتبر ہے۔ تاریخ اور مذہب کا بھی انہیں مکمل شعور ہے مگر وہ تنگ نظری کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اس لئے انہیں عام مولوی سرسید کی طرح آزاد منش سمجھتے ہیں۔ شور صاحب نظم اور غزل پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ جدید تراکیب کی ان کے کلام میں فراوانی پائی جاتی ہے۔ ان کی نظموں میں جوش ملیح آبادی کی طرح گھن گرج بھی ہوتی ہے اور فکری رفعت بھی۔ وہ ایک ذی علم فنکار کی حیثیت سے عصر حاضر کے شعراء اور ادباء میں لائق احترام سمجھے جاتے ہیں۔

گفتگو کا ساز کیا، تخیّل کی آواز کیا
پُر شکستہ لفظ و معنی، آبلہ پا عقلِ خام
عالمِ لاہوت سے طرزِ بیاں لا دو مجھے !
نام آیا ہے، لبوں پہ اُس رسولِ پاک ؐ کا
عرش جس کا فرش پا ہفت آسماں جسکی زمیں
آیۂ والشمس جسکے روئے تاباں کی قسم
وہ رسول دوسرا، وہ تاجدارِ بحر و بر
فقر سے جس کے شہنشاہی کو آیا ہے زوال
جس کے ہیں افسانہ خواں بیگانۂ غم بام و در
لوٹتے ہیں جسکی ٹھوکر میں شہنشاہوں کے تاج
رحمتیں جس کی کنیزیں، مغفرت جسکی سفیر
رحمت اللعالمیں بنکر جو آیا وہ رسول ؐ
وہ غریبوں کا سہارا، وہ یتیموں کی پناہ
وہ شہِ کونین، وہ عصمت پناہ و ہست بود
وہ شہنشاہِ اُمم، وہ بندۂ یزداں صفات
نسخۂ جس کے ورق ہوش کا دیباچہ گر
بامِ عرفانِ نبی ؐ پر عقل کی پرواز کیا
لب کشائی کی کسی کی جرأت کسکو یارائے کلام
عرش سے کوئی فرشتوں کی زباں لا دو مجھے
معرفت میں جسکی جھک جاتا ہے سرِ ادراک کا
آستاں جس کا ہے بوسہ گاہِ جبریلِ امیں
نکتۂ والیل جس کے گیسوؤں کا پیچ و خم
جس کے قدموں پر جھکا ہے قیصر و کسریٰ کا سر
جسکی عظمت کہا گئی اسکندر و جم کا جلال
چین تک پہنچی ہے اڑ کر جسکی گردِ رہگذر
نائبِ یالیتنی ہے جسکی آماجگاہ بے خراج
جس نے ارزاں کیا اولادِ آدم کو ضمیر
آدمی کو آدمی جس نے بنایا، وہ رسول ؐ
زندگی جسکی بندگی جس کا تنفس لا اِلٰہ
بندگی جسکی عبادت ہر نظر جس کی سجود
نسلِ آدم کو سکھائے جس نے آدابِ حیات
جس کے بامِ معرفت پر عقل کے جلتے ہیں پر

بے وضو لینے نہیں، روح الامیں بھی جسکا نام
اُسکی شاہی کو سلام، اُسکی فقیری کو سلام

ساقی کے حضور

ترے ماحول کی صہبا بھی کتنی خام ہے ساقی
کہ ہم پر مستیوں کا بے سبب الزام ہے ساقی

مسلّم احترامِ حافظ و خیام ہے ساقی
مگر یاں تو فریبِ جام و مینا عام ہے ساقی

یہ رُت، یہ سبزہ و گل، یہ ہوا، یہ ابر، یہ سایہ!
یہاں تو ہر قدم پر دام زیرِ دام ہے ساقی

اُٹھادوں گر حجابِ جام و مینا تیری نظروں سے
تو آہنگِ مے و مینا بھی اک کہرام ہے ساقی

تری چشمِ کرم اس بزم میں رسوا نہ ہو جائے
خراشِ دل چھپا کر مسکرانا عام ہے ساقی

کسی کا قلب ٹوٹے خون اپنی آنکھ سے ٹپکے
شعورِ آدمیت کا یہی انجام ہے ساقی

سوادِ دیر و کعبہ میں بھی مشکل ہی سے ملتی ہے
وہ اک جنسِ گرانِ انساں جس کا نام ہے ساقی

بہ ظرفِ بیخودی نظروں کو دے تکلیفِ آزادی
حرم سے تبکدے تک لغزش اک گام ہے ساقی

تری محفل میں اپنے ہونٹھ سی کر ہم تو بیٹھے ہیں
مگر پھر بھی ہماری خامشی بدنام ہے ساقی

وطن سے دور غربت میں یہ اکثر میں نے سوچا ہے
یہ سورج کی کرن ہے یا سوادِ شام ہے ساقی

بہ بر مصلحت چپ ہوں، مگر یہ بھی کیا ہوگا
سوادِ شب سے کرنوں تک مرا پیغام ہے ساقی

○

آنکھ نم ہو تو کس بہانے سے
بات بنتی نہیں بنانے سے

کتنی نظریں ہوئیں خراب نہ پوچھ
ایک تیرے نظر جھکانے سے

بجھ گیا ہر چراغ دیر و حرم
عشق کا اک دیا جلانے سے

وہ حرم میں بھی سرنگوں نہ ہوا
جو اٹھا تیرے آستانے سے

ذرّہ ذرّہ ہے آفتاب بدوش
تیرے رخ سے نقاب اٹھانے سے

باتوں باتوں میں روٹھنا اُس کا
اس بہانے سے اُس بہلنے سے

کوئی اپنا نظر نہیں آتا
کیا وفا اُٹھ گئی زمانے سے

ہر حقیقت کی ہم نے رکھ لی لاج
اک فریبِ مجاز کھانے سے

جو گزرتی ہے وہ گزرتی ہے
کون شکوہ کرے زمانے سے

جو ٹپک جائے آنکھ سے اے شورؔ
وہ چھپے راز کیا چھپانے سے

فہرست

۱۔ جوشؔ ملیح آبادی ۷
۲۔ قمرؔ جلالوی ۱۰
۳۔ نسیمؔ امروہوی ۱۵
۴۔ سید آلِ رضا ۲۲
۵۔ رئیسؔ امروہوی ۲۴
۶۔ صباؔ اکبرآبادی ۲۹
۷۔ سراج الدین ظفرؔ ۳۲
۸۔ پروفیسر منظور حسین شورؔ ۳۵
۹۔ بہزادؔ لکھنوی ۳۹
۱۰۔ ارمؔ لکھنوی ۴۲
۱۱۔ منوّرؔ بدایونی ۴۵
۱۲۔ ماہرؔ القادری ۴۷
۱۳۔ سید محمد جعفری ۴۹
۱۴۔ ادیبؔ سہارنپوری ۵۲
۱۵۔ نازشؔ حیدری ۵۵
۱۶۔ شاعرؔ لکھنوی ۵۸
۱۷۔ ڈاکٹر یاور عباس ۶۱
۱۸۔ مصطفیٰ زیدی ۷۱
۱۹۔ تابشؔ دہلوی ۷۴
۲۰۔ رازؔ مرادآبادی ۸۱
۲۱۔ فداؔ خالدی ۸۳

بہزاد لکھنوی

نعت گوئی کا سلسلہ حضرت ابو طالب سے شروع ہوا۔ حضرت علیؑ مرتضیٰ، جناب حسان بن ثابتؓ اور دیگر اصحاب کرام نے نعتیں لکھیں اور یہ سعادت ہر زمانے میں مختلف زبانوں میں شعرائے کرام حاصل کرتے رہے۔ اردو میں بھی ابتدائی دور سے نعت گوئی پائی جاتی ہے۔ عصرِ حاضر میں بہزاد لکھنوی نے نعت گوئی کو بطور خاص اپنایا۔ وہ عاشقِ رسولِ کریمؐ تھے۔ والہانہ انداز میں مدحتِ ختم الانبیاء میں ہمیشہ وقف رہے۔ انہوں نے نعت گوئی کے حوالے سے صفحوں پر اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔ عقیدت و محبت کا ایک گہرا سمندر ہے جو ان کے نعتیہ کلام میں موجزن ہے۔ سادگی اور روانی کے سبب ان کا کلام مقبول عام ہوا۔ بہزاد لکھنوی نے ایسا سرمایۂ سخن چھوڑا ہے۔ جس میں کردار و سراپائے رسولِ کریمؐ منعکس ہے۔ ان کی دیوانگی اور شگفتگی ایک دل نشیں امتزاج لئے ہوئے ہے وہ کہتے بھی والہانہ انداز سے تھے اور پڑھنے میں بھی ان کا منفرد انداز تھا۔

نعرۂ حق

جسے عشقِ سرکارِ بطحا نہیں ہے
وہ اپنی حقیقت کو سمجھا نہیں ہے

پہنچ کر مدینے میں اے آنے والے
محبت کا یہ تو تقاضہ نہیں ہے

مدینے مجھے لے چلو چارہ سازو
بجز اس کے کچھ تم سے کہنا نہیں ہے

الٰہی دکھادے مدینے کی گلیاں
مدینہ کبھی میں نے دیکھا نہیں ہے

خدا کی طلب ہے تو بطحا کو پہنچو
کوئی دوسرا اور رستہ نہیں ہے

بجز آپ کے اے شفیعِ دو عالم
سرِ حشر کوئی سہارا نہیں ہے

پڑھوں نعت بہزاد بطحا میں جاکر
بجز اس کے کوئی تمنا نہیں ہے

زہے نصیب

تصوّر میں مدینہ آگیا ہے
مجھے دنیا میں جینا آگیا ہے

سُنا ہے مِل گیا اذنِ حضوری
لبِ ساحل سفینہ آگیا ہے

یہ دل جُھکنے لگا ہے اُن کی جانب
محبّت کو قرینہ آگیا ہے

درُودِ پاک رہتا ہے زباں پر
تمنّاؤں کو جینا آگیا ہے

ہے روشن داغِ دل عشقِ نبیؐ سے
جِلا ہو کر نگینہ آگیا ہے

تصوّر میں وہ روضہ اللہ اللہ
دو عالم کا خزینہ آگیا ہے

زہے یادِ مدینہ دردِ دُوری
مجھے بہزاد جینا آگیا ہے

LIBRARY
Aligarh Urdu, Hindi

ارم لکھنوی

دبستانِ کراچی میں ارم لکھنوی بحیثیت غزل گو ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں نازک خیالات سے جو مضمون آفرینی کی ہے وہ قابل توجہ ہے۔ وہ ایسی غزل کہتے تھے جو عام فہم ہوتی تھی۔ ان کے کلام میں علوئے تخیل سے زیادہ بے ساختہ پن نمایاں ہے۔ رواں اور سادہ اشعار کہتے تھے اور ان میں جاذبیت کی فراوانی کا بطور خاص عنصر ہوتا تھا۔ بہزاد لکھنوی کی طرح انہوں نے سلاست کو خاصی اہمیت دی اور وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ کہتے بھی خوب تھے اور پڑھنے کا انداز بھی خوب تھا۔ انہوں نے نعت و منقبت کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے حضور سلام بھی خوب کہے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اہلِ دل شاعر تھے اور کربلا کے حوالے سے زندگی کو سنوارنا اپنا نصب العین سمجھتے تھے۔

نعت

درِ نبیؐ پہ جسے باریاب دیکھا ہے
اس ایک ذرّے کو پھر آفتاب دیکھا ہے

تمہارے ایک ہی معجز نما اشارے میں
دو نیم ہوتے ہوئے ماہتاب دیکھا ہے

خدا سے نامِ محمدؐ پہ جب دُعا مانگی
دُعا کو ہوتے ہوئے مستجاب دیکھا ہے

ہمارا کعبۂ دل اور رسولؐ کا جلوہ
یہ واقعہ ہے الٰہی کہ خواب دیکھا ہے

ارم لگائی ہے جب دل نے لَو محمدؐ سے
ہر ایک جذبۂ دل کامیاب دیکھا ہے

غزل

درد کا جب تک مزا حاصل نہ تھا
دل کہے جانے کے قابل دل نہ تھا

ہائے ان مجبوریوں کو کیا کروں
میں بھی خود فریاد کے قابل نہ تھا

بھیک رکھ لو جو دعائیں دے گیا
وہ فقیرِ عشق تھا سائل نہ تھا

او لٹانے والے گلہائے کرم
سب کا دل تھا کیا ہمارا دل نہ تھا

جاں بری مشکل بھی ہم کو اے ارمؔ
وہ بچا لیتے تو کچھ مشکل نہ تھا

منور بدایونی

منور بدایونی ایک صاحبِ دل بزرگ شاعر تھے۔ انہوں نے شاعری کو عبادت سمجھ کر اختیار کیا اور اپنے نظریے پر ہمیشہ کاربند رہے۔ سہل ممتنع میں ان کا کلام بہزاد لکھنوی کی طرح بڑا ہی اثر آفریں ہے۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑے بڑے مضامین خوب باندھے ہیں۔ لطافت زبان اور سادگی کا لطف ان کے کلام میں نمایاں ہے بسا اوقات تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ نثری الفاظ نے نظم کا پیکر اختیار کر لیا ہے۔ یہ خوبی اب بہت ہی کم شعراء کے ہاں پائی جاتی ہے۔ منور بدایونی کے دل میں عشقِ رسولِ کریم کی شمع روشن تھی۔ وہ ایک عاشقِ رسولؐ کی حیثیت سے بھی اپنے زمانے میں محترم سمجھے جاتے تھے۔ ان کی نعت گوئی دل کی سچی آواز کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ نعتیں کیا ہیں صفحات پر انہوں نے اپنا دل رکھ دیا ہے۔ سرکارؐ رسالت مآب کی مدح کے مختلف پہلو بڑی ہی سادگی سے ان کے کلام کو رونق عطا کئے ہوئے ہیں۔ بحیثیت نعت گو انہیں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ان کے تذکرے کے بغیر عصرِ حاضر کی نعت گوئی پر تبصرہ ناممکن ہے۔

دیکھنے کو تو کیا کیا نہ دیکھا
تجھ کو دیکھا تو تجھ سا نہ دیکھا

دل ہی جب مصطفےٰ کا نہ دیکھا
سب برابر ہے دیکھا نہ دیکھا

ان کو پایا تو کیا کیا نہ پایا
اُن کو دیکھا تو کیا کیا نہ دیکھا

ان کے پردوں کے جلوے تو دیکھے
ان کے جلوؤں کا پردا نہ دیکھا

پانے والوں کے دامن بھرے ہیں
دینے والے کو دیتا نہ دیکھا

بے طلب مل رہی ہیں مرادیں
مانگتے ان کا منگتا نہ دیکھا

نیّتیں سب کی بھر دی گئی ہیں
اس قدر دینے والا نہ دیکھا

جس کے سائے میں دیکھی یہ دنیا
اس کا دنیا میں سایا نہ دیکھا

سامنے ہے وہ جلوہ مُنوّر
دیکھ لے، پھر نہ کہنا نہ دیکھا

ماہر القادری

مولانا ماہر القادری ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ جوانی میں غزل گوئی کے رسیا تھے۔ ان کی عاشقانہ نظمیں بے حد پسند کی جاتی تھیں اور وہ خود بھی بہت ہی عمدہ ترنم میں حکایتِ دِل پیش کرتے تھے رواں مصرعے اور ان کا حسنِ ادا مشاعروں کی زینت رہا۔ لیکن جب وہ نعت گوئی کی طرف رجوع ہوئے تو منزل سے دلچسپی ختم ہوگئی۔ انہوں نے اپنی عاشقانہ شاعری کو فاسقانہ شاعری قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کا کفارہ ادا کرتے رہے تھے۔ ان کی نعتوں میں بے ساختگی اور واردات قلبی کا ایک سیلاب پایا جاتا ہے۔ "سلام اس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی" ان کے نعتیہ اشعار برصغیر میں مقبول و مشہور ہوئے۔ مولانا ماہر القادری ایک بلند پایہ صحافی بھی تھے۔ فاران جیسا رسالہ ان کے ذوقِ صحافت کی یادگار ہے۔ انہیں مضمون نگاری سے بھی دلچسپی تھی انہوں نے کئی درجن مضامین لکھے جو پاکستان کے مختلف معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ وہ کوئی باقاعدہ تنقید نگار نہیں تھے مگر ان کے مضامین میں تاثراتی تنقید کا انداز نمایاں ہے۔

سلام اس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں
سلام اس پر جو سچائی کی خاطر دکھ اٹھاتا تھا
سلام اس پر جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا
سلام اس پر کہ جس کی سادگی درس بصیرت تھی
سلام اس پر کہ جس کی ذات فخرِ آدمیت تھی
سلام اس پر کہ جس نے جھولیاں بھر دیں فقیروں کی
سلام اس پر کہ مشکیں کھول دیں جس نے اسیروں کی

۲۲۔ سلیم احمد ۸۷
۲۳ اقبال عظیم ۹۰
۲۴۔ شان الحق حقی ۹۲
۲۵۔ ادا جعفری ۹۵
۲۶۔ اطہر نفیس ۹۸
۲۷۔ ابنِ انشا ۱۰۱
۲۸۔ پروفیسر انجم اعظمی ۱۰۴
۲۹۔ عزیز حامد مدنی ۱۰۶
۳۰۔ پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی ۱۰۹
۳۱۔ محشر بدایونی ۱۱۴
۳۲۔ مشفق خواجہ ۱۱۸
۳۳۔ جمیل الدین عالی ۱۲۲
۳۴۔ راغب مراد آبادی ۱۲۵
۳۵۔ حنیف اسعدی ۱۲۷
۳۶۔ حمایت علی شاعر ۱۲۹
۳۷۔ رشید انجم ۱۳۳
۳۸۔ امید فاضلی ۱۳۶
۳۹۔ سرشار صدیقی ۱۳۹
۴۰۔ جون ایلیا ۱۴۳
۴۱۔ قمر جمیل ۱۴۸
۴۲۔ محسن بھوپالی ۱۵۲
۴۳۔ افتخار عارف ۱۵۵
۴۴۔ پروین شاکر ۱۵۸

سیّد محمد جعفری

سید محمد جعفری اپنے عہد کے سب سے بڑے مزاح نگار تھے ن کا ادبی مطالعہ بھی وسیع تھا اور ان کے مشاہدات بھی گہرے تھے۔ انہوں نے مزاح نگاری کو نئے زاویوں سے ہمکنار کیا۔ وہ صرف ہنسنے ہنسانے کے قائل نہیں تھے ان کا مقصدِ شاعری معاشرتی اقدار کا فروغ تھا۔ وہ ظریفانہ انداز میں حیات اور کائنات کے حقائق کو ایسے دلکش انداز میں پیش کرتے تھے کہ ان کی بات عوام کے دلوں میں اتر جاتی تھی۔ ان کی ظرافت میں تنقیدِ حیات کا عنصر نمایاں تھا یہی سبب ہے کہ ان کا کلام مزاحیہ ہوتے ہوئے عقیدت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے ایک ذی شعور فنکار کی حیثیت سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے افکار سے معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی کی۔ طبقاتی کشمکش اور سرمایہ و مزدور کی گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے اپنی شاعری سے قابلِ ذکر خدمت انجام دی۔

ایبسٹریکٹ آرٹ

ایبسٹریکٹ آرٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے
کی تھی از راہِ مروّت بھی ستائش میں نے

آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا تو شرماتا ہوں

صرف کہہ سکتا ہوں اتنا ہی وہ تصویریں تھیں
یار کی زلف کو سلجھانے کی تدبیریں تھیں

ایک تصویر کو دیکھا جو کمالِ فن تھی
بھینس کے جسم پر اک اونٹ کی سی گردن تھی

ٹانگ کھینچی تھی کہ مسواک جسے کہتے ہیں
ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں

نقشِ محبوب مصوّر نے سجا رکھا تھا
مجھ سے پوچھو تو تپائی پہ گھڑا رکھا تھا

یہ سمجھنے کو کہ یہ آرٹ کی کیا منزل ہے
ایک نقّاد سے پوچھا جو بڑا قابل ہے

سبزۂ خط میں وہ کہنے لگا رعنائی ہے
میں یہی سمجھا کہ ناقص مری بینائی ہے

بولی تصویر جو میں نے اُسے اُلٹا پلٹا
میں وہ جامہ ہوں کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا

اُس کو نقاد تو اک چشمۂ حیواں سمجھا
مَیں اُسے حضرتِ مجنوں کا گریباں سمجھا

ایک تصویر کو دیکھا کہ یہ کیا رکھا ہے
ورقِ صاف پہ رنگوں کو گرا رکھا ہے

آڑی ترچھی سی لکیریں تھیں وہاں جلوہ فگن
جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے پہ سورج کی کرن

بولا نقاد جو یہ آرٹ ہے تجریدی ہے
آرٹ کا آرٹ ہے تنقید کی تنقیدی ہے

تھا کیوبؔ ازم میں کاغذ پہ جو اک مشکِ قمر
مجھ کو اینٹیں نظر آتی تھیں اُسے حسنِ بشر

بولا نقاد نظر آتے یہی کچھ ہم تم!
خُلد میں حضرتِ آدم جو نہ کھاتے گندم

○ تجریدی مصوری کا ایک مکتب جس میں تصویر کو کشش پہلو ٹکڑوں سے تشکیل دیا جاتا ہے۔

ایبسٹریکٹ آرٹ بہر طور نمایاں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

وہ خدوخال کہ ثانی نہیں جن کا کوئی آج
بات یہ بھی ہے کہ ملتا نہیں رنگوں کا مزاج

دیر تک بحث رہی مجھ میں اور اس میں جاری
تب یہ ثابت ہوا ہوتی ہے یہ اک بیماری

اس کو کیوبزم کا آزار کہا کرتے ہیں
اس کے خالق جو ہیں بیمار رہا کرتے ہیں

ایبسٹریکٹ آرٹ کے ملبے سے یہ دولت نکلی
جس کو سمجھا تھا انا س وہ عورت نکلی

ایبسٹریکٹ آرٹ کی اس چیز پہ دیکھی اساس
"تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس"

اس نمائش میں جو اطفال چلے آتے تھے
ڈر کے ماؤں کے کلیجوں سے لپٹ جاتے تھے

ایبسٹریکٹ آرٹ کا اک یہ بھی نمونہ دیکھا
فریم کاغذ پہ تھا کاغذ جو تھا سونا دیکھا

وہ ہمیں کیسے نظر آئے جو منظوم نہیں
"لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں معلوم نہیں"

ڈر سے نقادوں کے اس آرٹ کو یوں سمجھے تھے ہم
"شاید بستی مطلق کی کمر ہے عالم"

الغرض جائزہ لے کر یہ کیا ہے انصاف
آج تک کر نہ سکا اپنی خطا خود میں معاف

میں نے یہ کام کیا سخت سزا پانے کا
یہ نمائش نہ تھی اک خواب تھا دیوانے کا

کیسی تصویر بنائی مرے بہلانے کو
اب تو دیوانے بھی آنے لگے سمجھانے کو

ادیب سہارنپوری

غزل کی نزاکت اور سوز و گداز کے حوالے سے ادیب سہارنپوری کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بے ساختہ اور رواں کہتے تھے۔ ان کے کلام میں حسن آفرینی ملتی ہے اور ایک کسک بھی پائی جاتی ہے۔ وہ ایک عمدہ شاعر تھے شاعرانہ خوبی کے ساتھ ساتھ ان کے پڑھنے کا انداز بھی اثر انگیز تھا۔ وہ اپنے کلام کی روانی و لطافت اور عمدہ ترنم کے سبب مشاعروں میں چھا جایا کرتے تھے۔ ان کی موجودگی مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت ہوتی تھی۔

ادیب سہارنپوری نے غزل کے ہر پہلو کو خوب برتا ہے بعض اشعار تو سہل ممتنع میں ہوتے ہوئے معانی کے سمندر لئے ہوئے ہیں وہ ایک پختہ فکر شاعر تھے۔ انہوں نے جو بھی محسوس کیا اس کے اظہار اور اس کی ترجمانی میں انہوں نے کامیابی حاصل کی دبستانِ کراچی کے شعراء کا تذکرہ ان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔

○

وہ پَو پھٹی وہ کرن سے کرن میں آگ لگی
وہ شب کی زلفِ شکن در شکن میں آگ لگی

سلگ اُٹھی وہ ردائے نجوم و کاہکشاں!
وہ دیکھ دامنِ چرخِ کُہن میں آگ لگی

نشاطِ گرمیِ محفل تھی جس کی تابانی
اسی چراغ سے کیوں انجمن میں آگ لگی

ہزار شمس و قمر بُجھ گئے، پہ یہ نہ بُجھی،
یہ کس شرر سے پتنگوں کے من میں آگ لگی

تمام عُمر کے آنسو اسے بُجھا نہ سکے
جو دل سے تا بہ جگر دم زدن میں آگ لگی

بُھلا سکے گی نہ دُنیا یہ حادثہ کہ ادیبؔ
چراغِ لالہ و گُل سے چمن میں آگ لگی

○

اک خلش کو حاصلِ عمرِ رواں رہنے دیا
جان کر ہم نے انہیں نامہرباں رہنے دیا

آرزوئے قرب بھی بخشی دلوں کو عشق نے
فاصلہ بھی میرے اُنکے درمیاں رہنے دیا

کتنی دیواروں کے سائے ہاتھ پھیلاتے رہے
عشق نے لیکن ہمیں بے خانماں رہنے دیا

اپنے اپنے حوصلے اپنی طلب کی بات ہے
چن لیا ہم نے تمہیں سارا جہاں رہنے دیا

کون اس طرزِ جفائے آسماں کی داد دے
باغ سارا پھونک ڈالا آشیاں رہنے دیا

یہ بھی کیا جینے میں جینا ہے بغیر انکے ادیبؔ
شمع گل کر دی گئی باقی دھواں رہنے دیا

نازش حیدری

خیام الہند حضرت حیدر دہلوی کے شاگردوں میں نازش حیدری کو بلند مقام حاصل تھا۔ وہ اپنے استاد کی رحلت کے بعد ان کے جانشین بھی بنائے گئے۔ انہیں پرانی قدروں سے گہرا لگاؤ تھا جو احترام کی حد تک پایا جاتا تھا۔ انہوں نے اگرچہ زیادہ تر روایتی شاعری کی ہے اور استادی کے جوہر دکھلائے ہیں مگر آخری ۵ برسوں میں ایسی غزلیں بھی کہیں جو موضوعات کے اعتبار سے جدیدیت کے روشن پہلوؤں کی آئینہ دار ہیں۔ انہیں ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ ایک عرصہ تک روزنامہ جنگ سے وابستہ رہے۔ چونکہ ان کے مزاج میں سرگرم عمل رہنے کا جذبہ قابل ذکر حد تک موجود تھا اس لئے وہ جہاں بھی رہے انہوں نے وہاں اپنا ایک مقام پیدا کیا۔ مختلف اصناف سخن سے انہیں شغف رہا۔ ان کی منظومات بھی اثر آفریں ہیں۔

۱۲۳۲۳

اللہ رے اُس مہرِ نبوت کی ضیائیں
ماحول میں گرمی ہے نہ یخ بستہ فضائیں

دربارِ نبیؐ میں ہیں عطائیں ہی عطائیں
چلتی ہیں فقط ایک ہی رُخ پر یہ ہوائیں

خورشید نے مہتاب نے تاروں نے اُڑالیں
پھوٹیں رُخِ انور کی ضیا سے جو ضیائیں

سُنتا ہوں درِ پاک سے فردوس کے نغمے
جالی سے نکلتی ہیں جو چھن چھن کے ہوائیں

تیرا ہی کرم ہے کہ گنہگار کے سر پر
تحلیل ہوئی جاتی ہیں رحمت کی گھٹائیں

دل نعت سُنا تا رہے لحنِ مدنی میں
جب تک کہ اس آواز سے ہم جھوم نہ جائیں

شفاف کریں دل کو عقیدت کی جلا سے
اُس بزم کے قابل کوئی آئینہ بنائیں

ہم جھوم کے اس طرح چلے سوئے مدینہ
ہیں خُلد کے جھونکے کبھی دائیں کبھی بائیں

آقائے مدینہ مجھے بلوائیں تو نازشؔ
تیزی میں فرشتے بھی مری گرد نہ پائیں

○

اب دل میں آرزوؤں کے آثار دیکھنا
ویرانیوں میں شہر نمودار دیکھنا

کون آگیا چراغ کی لو کس نے تیز کی؟
شعلے سے ہو گیا ہے کسے پیار دیکھنا

دو اشک چشمِ ناز کی دنیا بدل گئے
اک برگِ گل پہ اوس کی مقدار دیکھنا

منصور اک گرفت میں منصور ہو گیا
بندہ نوازیِ رسن و دار دیکھنا

یہ کون جھانکتا ہے دریچے سے بار بار
لَو دے رہا ہے سایۂ دیوار دیکھنا

دامن سے دور رہ گیا ہاتھ آفتاب کا
اس آنے والی صبح کی رفتار دیکھنا

شاعر لکھنوی

شاعر لکھنوی نے روایتی غزلیں بھی خوب لکھیں اور جب وہ جدیدیت کی طرف مائل ہوئے تو ان کے کلام میں قدیم اور جدید انداز کے سبب ایک ایسا امتزاج پیدا ہوا کہ ان کی آواز کو معتبر سمجھا جانے لگا۔ شاعر لکھنوی نے مجازی رنگ میں بھی خوب گل کاری کی ہے اور گردشِ دوراں سے متعلق جو اشعار کہے ہیں ان سے ان کی فکری عظمت اور تخیل کی گہرائی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ شاعر لکھنوی نے زندگی کی سچائیوں کو فکر و فن کے ذریعہ عوام میں دلنشیں انداز سے پیش کرتے ہوئے بحیثیت ایک فنکار قابلِ ذکر مقام پیدا کیا۔ انہیں پاکستان سے باہر دیگر ممالک میں بھی مشاعرے پڑھنے کے لئے اکثر بلایا گیا اس طرح انہیں بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔

ابتدائیہ

شعر و ادب کے حوالے سے پاکستان میں دبستانِ کراچی اور دبستانِ لاہور کی نمایاں خدمات ہیں۔ دبستانِ کراچی کے شعراء نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر عمدہ فنکار نے وقت کے تقاضوں کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دیئے ہیں۔

دبستانِ کراچی سے متعلقہ شعراء کی تعداد کثیر ہے۔ راقم الحروف نے چند ممتاز شعراء پر مختصر تبصرہ اور ان کا نمونۂ کلام پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دبستانِ کراچی کے حوالے سے یہ پہلا کام ہے۔ امید ہے کہ اہل علم اس کام کو آگے بڑھائیں گے۔

خادمِ ادب

نعیم الحق ضیاضیائی

یہ جو صہبائے دل ربائی ہے
کتنے شیشوں سے چھن کے آئی ہے

خونِ دل بھر کے جام میں رکھو
موسمِ گُل کی رونمائی ہے

راہ میں بے سبب نہیں کانٹے
احترام برہنہ پائی ہے

گل میں رہ کر ہے بوئے گُل آزاد
ہر اسیری میں اک رہائی ہے

بندگی وہ مقام ہے کہ جہاں
خود شناسی بھی خود نمائی ہے

تیرا غم درمیاں میں تھا ورنہ
زندگی کس کو راس آئی ہے

تیرے رُخ کی بہار کے آگے
پھول اک کاسۂ گدائی ہے

اُس نظر کے حضور اے شاعر
کچھ نہ کہنا بھی لب کُشائی ہے

آئے طوفان کے جھونکے کیا کیا
اُٹ گئے گرد میں چہرے کیا کیا

باغ کی کوئی خبر ہی نہ ملی
جانے مہکے ہوں شگوفے کیا کیا

دور تک جن میں بچھے ہیں کانٹے
پاؤں پڑتے ہیں وہ رستے کیا کیا

میں چمن میں ہوں مگر یاد نہیں
تھا بہار آنے سے پہلے کیا کیا

راہ کا ہم کو سمجھ کر تنکا
رقص کرتے ہیں بگولے کیا کیا

جرم تھی سعیِ تکلم پہلے
اب ہیں چُپ رہنے پہ پہرے کیا کیا

غم ہزاروں تھے جو اپنائے ہیں
پھر بھی ہیں درد کے رشتے کیا کیا

ذکرِ بیداری گلشن پہ مجھے
آئے ہیں نیند کے جھونکے کیا کیا

خود کہے دیتی ہیں آنکھیں شاعرؔ
دل میں اُبھرے ہیں سویرے کیا کیا

ڈاکٹر یاور عباس

سید یاور عباس ایک اہل دل شاعر تھے۔ اگرچہ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں مگر ان کی پہچان مدحِ محمدؐ و آلِ محمدؐ ہے۔ ان کا یہ قطعہ تو برصغیر میں مشہور ہے۔

قسمت میں مری چین سے جینا لکھ دے
ڈوبے نہ کہیں میرا سفینہ لکھ دے
جنت بھی گوارا ہے مگر میرے لئے
اے کاتبِ تقدیر مدینہ لکھ دے

ڈاکٹر یاور عباس کا کلام ان کے دل کی دھڑکنوں سے معمور ہے۔ انہوں نے عمدہ مرثیے بھی کہے بحیثیت مرثیہ گو ایک نام پیدا کر گئے۔ دہلی کی ٹکسالی زبان اور والہانہ اندازِ بیان ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ نہایت شائستہ مرثیہ نگار تھے۔

ڈاکٹر یاور عباس نے مرثیوں میں نہایت برجستگی اور بے باکی سے مسائلِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مرثیوں کو کربلا سے مربوط کیا ہے۔ وہ ایک عمدہ فنکار اور بڑے ہی پیارے انسان تھے۔ ان کے مرثیوں سے ان کا متین اور شگفتہ مزاج بھی جھلکتا ہے۔

نعتِ رسول پاک

محراب کرم ہے خم ابروئے محمدؐ
رحمت کی گھٹا سایہ گیسوئے محمدؐ

اقدار کے پیمانے ڈھلے قول نبیؐ سے
اخلاق کا معیار نبیؐ خوئے محمدؐ

میزانِ عدالت ہے شکن لوحِ جبیں کی
انصاف ہے منتِ کش ابروئے محمدؐ

جس باغ میں بھی جاؤ مدینہ کی بہاریں
جس پھول کو سونگھو وہی خوشبوئے محمدؐ

ترشا ہوا ناخنؐ ہے مہ عید فلک پر
اب لائے تصور میں کوئی روئے محمدؐ

ہوں شہرِ پُر آشوبِ کراچی میں مگر وہ
دل سجدہ کہاں ہے طرف کوئے محمدؐ

روشن ہو مقدر کا ستارہ ابھی یا در
پڑ جائے اگر سایہ گیسوئے محمدؐ

دوستی کا جام لینا سیکھئے
عقل سے کچھ کام لینا سیکھئے
وقت کی ٹھوکر یہ کہتی ہے حضور
اب علیؑ کا نام لینا سیکھئے

کانٹے کچُل کے راہ کو ہموار کر دیا
مثلِ خلیلؑ آگ کو گلزار کر دیا
دل کو کفیلِ لذّتِ آزار کر دیا
قصرِ غرور و کبر کو مسمار کر دیا
صحرا میں مُسکرا کے ہَوا کو بدل دیا
مَرنے کی دلخراش ادا کو بدل دیا

وہ زندگی کے طورِ دکھائے کہ اَلاماں
وہ راستی کے ڈھنگ سکھائے کہ اَلاماں
بچّوں کے سر وہ ہنس کے کٹائے کہ اَلاماں
جاں دینے ایسی شان سے آئے کہ اَلاماں
اے دشتِ کربلا یہ محمدؐ کے لال ہیں
راہِ خدا میں آپ ہی اپنی مثال ہیں

سبطِ رسولؐ پہ ہے عجب وقت امتحاں
بے وجہ ٹوٹتی ہیں تشدد کی بجلیاں
یہ دشت اور یہ فوج نہیں گوشۂ اماں
زیرِ قدم زمین ہے اور سر پہ آسماں
آفات میں گھرا ہے جگر گوشۂ بتولؑ
اللہ رے حسینؑ کہ یہ بھی گھڑی قبول

جنّت کا وقت ختم، محبّت کا امتحاں
جرارت کا اور صبر کی طاقت کا امتحاں
شیرِ خدا کے شیر شجاعت کا امتحاں
اے نائبِ رسولؐ امامت کا امتحاں
اے فاطمہؑ کے لال ہمارا سلام لے
ٹوٹے دلوں کی آس دلوں کا پیام لے

اے بارگاہ فاتحِ خیبر سلام لے
اے ورثہ دار احمدؐ و حیدرؑ سلام لے
اے راہِ صبر و ضبط کے رہبر سلام لے
اے مردِ کارزار، دلاور سلام لے
اے بیکسوں کی آنکھ کے تارے سلام لے
انسان کی عظمتوں کے سہارے سلام لے

انصار مر چکے کوئی یاور بھی اب نہیں
قاسمؑ چلے گئے، علی اکبرؑ بھی اب نہیں
عونؑ و محمدؑ و علی اصغرؑ بھی اب نہیں
عباسؑ سا رفیق برادر بھی اب نہیں
راہ خدا میں قتل ہوا گھر کا گھر تمام
ہیں سُرخ تیرے خیمے کے دیوار و در تمام

آقا یہ قصد کیا ہے کدھر جا رہا ہے تُو
کتنا تھکا ہوا سا نظر آ رہا ہے تُو
کیا کیا ہلاکتوں کے مزے پا رہا ہے تُو
اب بھی تو فوجِ ظلم کو سمجھا رہا ہے تُو
سجدے بھی ہو رہے ہیں قیامت ہے اے حسینؑ
واللہ یہی تو شانِ امامت ہے اے حسینؑ

حد ہو چکی کوئی تو سنا دے انہیں حسینؑ
تھوڑا سا آب تیغ پلا دے انہیں حسینؑ
تیور علیؑ کے آج دکھا دے انہیں حسینؑ
تکبیر کی صدا تو سُنا دے انہیں حسینؑ

چھوڑے نہ ذوالفقار کسی بدنہاد کو
غرّہ رہے نہ بعد میں ابنِ زیاد کو

آبادہ شیر غیظ میں دشت و جبل ہلے
اٹھی وہ آستین، وہ فوجوں کے دل ہلے
دو چار کیا ہیں سینکڑوں نیزوں کے پھل ہلے
سینوں میں اہلِ کینہ کے دل برمحل ہلے
چمکی وہ ذوالفقار کہ بجلی چمک گئی
لاسیف ولا فتیٰ کی صدا دور تک گئی

تلوار سوئے اہلِ دغا کھیلتی چلی
سب تھے ہلاکِ نازِ ادا، کھیلتی چلی
ناگن سی مثلِ موج ہوا کھیلتی چلی
سرشار و شاد کام قضا کھیلتی چلی
طوفاں بدوش تُند، ہوا ساتھ ساتھ تھی
تلوار چل رہی تھی، قضا ساتھ ساتھ تھی

فہرستِ کشتگاں میں بہت سوں کا نام تھا
عجلت بہت تھی وقت تھا کم اتنا کام تھا

حملے کی خوبیوں میں بھلا کیا کلام تھا
لیکن کوئی خیال بھی پیشِ امام تھا
حکم خدا ہوا تو چلی تیغ بے مثال
جبریلؑ کی صدا پہ رُکے شاہ خوشخصال

رکا جو ہاتھ بھاگتے رہوار رک گئے
نکلی جو راہ سینکڑوں گمراہ رک گئے
بے آس ہو چکے تھے جو بدخواہ رک گئے
کوفے کا جن کا قصد تھا، ناگاہ رک گئے
دھبّہ ہے یہ شجاعت افواجِ شام پر
بزدل ہزاروں ٹوٹ پڑے تھے امام پر

دیوانہ وار ٹوٹ پڑے اشقیا تمام
رِس رِس کے خون جسم کا بہنے لگا تمام
اب مرحلہ حسینؑ نے سر کر لیا تمام
وہ زندگی کا آخری سجدہ ہوا تمام
مٹی پہ سر رکھا پسرِ بوتراب نے
چہرے پہ اپنے خون مَلا آفتاب نے

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

شوکتِ نشانِ جاہ و حشم ڈھونڈتی پھری
عزتِ قدومِ شاہِ اُمم ڈھونڈتی پھری
عظمتِ سلامتی کا عَلَم ڈھونڈتی پھری
غربت کسی کے نقشِ قدم ڈھونڈتی پھری
صحرا کسی کا نقشِ جبیں دیکھتا رہا
سورج کسی کا روئے مبیں دیکھتا رہا

نیزہ پہ سر کو ارض و سما دیکھتے رہے
بدلی ہوئی چمن کی ہوا دیکھتے رہے
یہ شانِ کاروبارِ وفا دیکھتے رہے
جامِ قضا میں خطِ بقا دیکھتے رہے
تقدیرِ بے نیازیٔ غم دیکھتی رہی
دُنیا شعارِ اہلِ ستم دیکھتی رہی

کشتی ابھی وہیں ہے کنارے بدل گئے
چُپ ہیں لبِ فرات کے دھارے بدل گئے
ظالم کا ظلم ختم، سہارے بدل گئے
ساعت گذر گئی وہ، ستارے بدل گئے

جوش ملیح آبادی

موجودہ صدی میں اقبال اور جوش جیسے عظیم شاعر پیدا ہوئے جن پر ہمیں ناز ہے۔ اقبال نے اسلامی اقدار کے حوالے اور جوش نے انسانیت کے حوالے سے ایسے افکارِ عالیہ پیش کئے ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔ جوش ملیح آبادی کو زبان اور بیان پر جو قدرت حاصل ہوئی وہ اردو ادب میں میر انیس کے علاوہ کسی کو میسّر نہیں۔ الفاظ ان کے سامنے دست بستہ حاضر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک طنطنہ اور وقار ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک بحر کی روانی ہے جو تھمنے نہیں پاتی۔ افکار کی بلندی سے ان کا کلام روکشِ ہفت آسماں ہے۔ وہ کونسا موضوع ہے جو انہوں نے انسانیت کے حوالے سے بیان نہ کیا ہو۔ جوش صاحب نے ۱۹۱۸ء میں ایسا انقلاب آفریں کلام کہا جس سے ان کی ترقی پسندی اور افکار کی ندرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک سے پہلے تنہا ایسی آواز بلند کی جس میں آزادی و حریت کا جوش اور محنت کشوں کے لئے پیامِ تسکین تھا۔ وہ خود ایک تحریک کی حیثیت رکھتے تھے۔

اب یہ قدم شاہِ کرم چھوڑتی نہیں
یہ ارضِ بینوا ہے قدم چھوڑتی نہیں

گہوارۂ حسینؑ سے تا دشتِ کربلا
ہر نقش اِک ثبوت ہے پائے ثبات کا
برحق ہے دین، ارفع و عالی ہیں مصطفےٰ
بے شک کہ صرف حمد کے شایاں ہیں کبریا
نیزہ پہ سر حسینؑ کا آنا دلیل ہے
اللہ بے نیاز ہے، ربِّ جلیل ہے

پامال جسم پاک ہوا، سر ہوا بلند
نامِ علیؑ و فاطمہؑ و مصطفےٰؐ بلند
وہ آفتاب شام میں دیکھا گیا بلند
میدان کربلا کا ہوا مرتبہ بلند
زینبؑ نے سوئے عرشِ خدا اک نگاہ کی
کانوں میں گونجتی ہے صدا اب بھی آہ کی

آئی صدا رسولؐ کی پیارے مرے حسینؑ
اے فاطمہؑ کے راج دلارے مرے حسینؑ

شیرِ خدا کی آنکھ کے تارے مرے حسینؑ
امت کی بخششوں کے سہارے مرے حسینؑ

اللہ دیکھتا ہے کہ تو کامیاب ہے
بے رہ روی کفر کا تو سدباب ہے

بے سر کی ایک لاش ہے جو بے کفن بھی ہے
ایسے کی لاش ہے جو اسیرِ محن بھی ہے
شاید یہ کوئی ایسا ہے جو بے وطن بھی ہے
پامال ہے سموں سے کہ چھلنی بدن بھی ہے
حالات کہہ رہے ہیں کہ اس کا کوئی نہیں
اچھا خدا ہے اس کا کہ جس کا کوئی نہیں

کچھ لوگ گرد لاش کے آتے ہیں نظر
روتی ہیں کون بی بی یہ اس طرح پھوٹ کر
یہ کون دو بزرگ چلے آئے ننگے سر
یہ کیا علیؑ ہیں اور شہنشاہؐ بحر و بر
یہ لاش کس غریب کی ہے کیوں یہ آئے ہیں
کس بے وطن کی لاش پہ زہراؑ کو لائے ہیں

مصطفیٰ زیدی

مصطفیٰ زیدی اپنے لب ولہجہ کی انفرادیت کے سبب بہت جلد ترقی پسند شعراء میں ممتاز ہوئے۔ وہ انسانی عظمت کے نقیب تھے انہوں نے اپنی شاعری کے حوالے سے انسانی اقدار کے فروغ کی مسلسل کوشش کی۔ تنگ دلی و تنگ نظری، قومی اور نسلی امتیازات میں بٹا ہوا انسان اور اس کے گھمبیر مسائل ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہے۔ انہوں نے ایک ذہین فنکار کی حیثیت سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ تصنع، تکلف، اور ملمع کاری کے خلاف آواز اٹھاتے رہے اور تلخ حقائق کا اظہار نہایت جرأت سے کرتے رہے۔ انہوں نے صرف تعفن زدہ ماحول اور حیات کے گھناؤنے پہلوؤں کو ہی اجاگر نہیں کیا بلکہ ستم خوردہ اور زخم خوردہ انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنے کے احکامات بھی واضح کئے۔ انہوں نے صرف گریہ وزاری پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی واضح کیا کہ جب تک ظلم وجور کے خلاف عزمِ صمیم سے محاذ آرائی نہیں جاتی ہے حالات معمول پر نہیں آسکتے۔

مصطفیٰ زیدی نے اپنی فکرِ رسا سے کام لیتے ہوئے وہ تخلیقی عمل کیا۔ جس میں احساسات و شعور کی بیداری کا پیغام تھا۔ ان کی شاعرانہ صداقت ان کے افکار سے آشکارا ہے۔ ان کی رمزیت اور اشاریت نے بھی انہیں انفرادیت سے ہمکنار کیا۔

کس بانکپن سے آئے تھے فنکار دیکھنا
کس کی گلی میں آکے ہوئے خوار دیکھنا
ہر گورکن ہے قوم کا معمار دیکھنا
ہر بوالہوس کا قربِ درِ یار دیکھنا
نام حسینیت پہ سرِ کربلائے عصر
کس کا علم ہے، کس کے علمدار دیکھنا
اے غم گسار! مجلسِ لیل و نہار میں
کس کی عزا ہے، کیسے عزادار دیکھنا
پڑھنا بلند بانگ و رجز خواں ادا لیے
اور بعد میں نمونۂ کردار دیکھنا
تکفیر کے چھپے ہوئے کانٹوں کے سامنے
تسبیح کے سجے ہوئے گل زار دیکھنا
رندی و انقلاب کا ہر نعرۂ عظیم
پہنے ہوئے ہے جبہ و دستار دیکھنا
ہر کوہ کن نے مصلحتِ شب شعار کی
نرغے میں ہے صداقتِ اقدار دیکھنا
اب امتیازِ دشمنی و دوستی گیا
اپنی صفوں میں آ گئے غدّار دیکھنا
اک سر زدش نظم کے اعلان حق کے بعد
اک حرّیت پسند کا انکار دیکھنا
سینوں کی دھڑکنوں میں چھپے گی وہ ایک نظم
حاصل نہ ہو سکا جسے اخبار دیکھنا
دائم رہے گا حافظۂ روزگار پر
وہ میرا بار بار سوئے دار دیکھنا

مجھ پر چلی ہے عین بہ ہنگامۂ سجود
اک زہر میں بجھی ہوئی تلوار دیکھنا
تنہا ہے کون اب پسِ زنداں جنابِ فیض
رسوا ہے کون اب سرِ بازار دیکھنا
اب کر رہے ہیں کون سی ازموں کی پرورش
لوح و قلم کے جملہ وفادار دیکھنا
تنقیدِ رُوئے ذاتِ نشیناں سے ہر طرف
سُوئے یلانِ عرصۂ پیکار دیکھنا
ان قاتلوں کے رقصِ سرِ عام کے حضور
ان عاقلوں کا مجلۂ پندار دیکھنا
اے چارہ ساز میری علالت کو بھول کر
اک فلسفی کی صحتِ افکار دیکھنا
صرصر کی زد میں آکے بھی روشن ہے اک چراغ
بجھنے لگے ہیں ثابت و سیّار دیکھنا
قائم ہے شہرِ سنگ میں بلور کا بدن
دَرکا ہوا ہے شیشۂ کہسار دیکھنا
بدلے اب اور کون سی کروٹ نظامِ نو
آئیں اب اور کون سے ادوار دیکھنا
شاید تمھیں نصیب ہو اے کشتگانِ شب
روئے افق پہ صبح کے آثار دیکھنا

تابش دہلوی

مسعود الحسن تابش دہلوی ایک کہنہ مشق اور ذی شعور شاعر ہیں۔ انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے غزل ہو یا نظم انہوں نے اپنی قادر الکلامی ہر جگہ منوائی ہے۔ ان کی شاعری کو مہذب شاعری کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے نہ تو وقتی نعرہ بازی کو اہمیت دی اور نہ ہی جذبات پرستی کے معیار کو گرنے دیا اس اعتبار سے ہم انہیں صحت مند فکر کے حوالے سے اہمیت دیتے ہیں آج کل یہ روش تقریباً عام ہے کہ تنقید نگار ہر عمدہ شاعر کو صاحب طرز اور منفرد قرار دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے۔ عمدہ شاعر ہونا اور منفرد شاعر ہونا ایک بات نہیں ہے۔ محتاط انتقادی انداز سے تابش صاحب کے لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ایک علیحدہ آواز ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے ان کے متعلق تحریر کیا ہے "تابش صاحب کی غزلیں جس کمال کے ساتھ ان کی انفرادیت کی آئینہ دار ہیں وہ اس دور کے بہت کم شاعروں کے حصہ میں آیا ہے۔ ان کی شاعری تہذیب یافتہ ادب کی بہترین مثال ہے۔ وہ پہلے دعوتِ فکر و نظر دیتی ہے اور پھر اپنے حسن کا وہ عالم دکھاتی ہے جس میں فکر ایسے لطیف لباس میں نظر آتی ہے جس کے رنگ کی ہم آہنگی عام نظر کے بس کی بات نہیں" تابش صاحب نے ایک طویل مشق اور فکر کے بعد واقعی ایک قابلِ ذکر مقام پیدا کر لیا ہے۔ نہ صرف پاکستان بلکہ انہیں بین الاقوامی سطح پر بھی جانا پہچانا جاتا ہے۔

مُردہ ضمیر و رُوح کا جاں بخش و چارہ گر
بے آب کھیتیوں کے لئے موجِ اَبرِ تَر
ہر دامنِ تہی کے لئے مخزنِ گہر
ہر پنجۂ مراد کو اِک شاخِ بارور
اِک بحرِ بے کنار وہ جُود و سخا کا ہے
اس کی متاع صرف توکّل خدا کا ہے

پیری ہے جس کی زہد و تقدّس کو محترم
تسبیح جس کا سانس ہے، تہلیل جس کا دَم
سجدے تو کیا حرم بھی ہے جس کی جبیں میں ضم
منزل رہِ صواب کی ہے جس کا ہر قدم
قلب و زباں کو شرع کا ہر حکم یاد ہے
شب اُس کی بندگی ہے دن اُس کا جہاد ہے

بھڑکی ہوئی ہے آگ جو ہر سُو عناد کی
بُو کربلا سے آتی ہے کون و فساد کی
آمادہ شر پہ فوج ہے ابنِ زیاد کی
شبیرؓ کے لئے ہے یہ ساعت جہاد کی
باطل سے اہلِ حق کا رویّہ شدید ہے
بیعت طلب حسینؓ سے پھر بھی یزید ہے

اعلانِ حق حُسینؓ کی جانب سے واشگاف
انکار تھا یزید کی بیعت سے صاف صاف
دنیا کرے ہزار حقیقت سے انحراف
مٹتا نہیں کبھی حق و باطل کا اختلاف
کرتے ہیں تنگ عرصۂ ہستی حُسینؓ پر
پانی ہے بند فاطمہؓ کے نورِ عین پر

اے بادِ اختلاف و ہَوائے ستم شعار
اے وقتِ نامساعد و عہدِ ستیزہ کار
اے عالمِ دنی و جہانِ ذلیل و خوار
اے آسمانِ بد رَوِش و چرخِ کج مدار
وہ باغبانِ باغِ رسالت کہاں گئے
وہ پاسبانِ شمعِ امامت کہاں گئے

ہیں سامنے نگاہ کے جلتے ہوئے خیام
شعلوں سے تمتمایا ہُوا ہے سوادِ شام
چرخِ کبود جن کی لپٹ سے ہے لالہ فام
پھر بھی نہیں ہے سرد ابھی جوشِ انتقام
منظر نظر کے سامنے ہے کربِ دید کا
خیموں کی آگ ہے کہ جہنّم یزید کا

باقی نشان تک نہیں اب خیمہ گاہ کا
دشتِ بلا سواد ہے اب اشک و آہ کا
کُشتہ ہر اک چراغ ہُوا حق کی راہ کا
ہے ہر طرف محیط اندھیرا نگاہ کا
اے کربلا وہ نُور کے پیکر کِدھر گئے
عبّاسؓ و قاسمؓ و علی اصغرؓ کِدھر گئے

وہ جن کے دم سے تھا چمن اسلام کا چمن
وہ خوش نگاہ و خوش دل و خوش فکر و خوش سخن
وہ گُل عذار و گُل رُخ و گُل رُو و گُل بدن
اب تک فضا میں جن کی ہے خوشبوئے پیرہن
زنجیر کوئی تجھ میں کوئی بے ردا ہُوا
اے دشتِ نینوا تری غیرت کو کیا ہُوا

شمعِ ہدایت

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری
رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بُتانِ آذری

تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے
بخشا گدائے راہ کو تو نے شکوہ قیصری

سلجھا ہوا تھا کس قدر تیرا دماغِ حق رسی
پگھلا ہوا تھا کس قدر تیرا دلِ پیمبری

چشمہ ترے بیاں کا غارِ حرا کی خامشی
نغمہ ترے سکوت کا نعرۂ فتح خیبری

زمزمہ تیرے ساز کا لحنِ بلالِ حق نوا
صاعقہ تیرے ابر کا لرزشِ روحِ بوذری

آئینہ تیرے خلق کا طبعِ حسنؑ کی سادگی
جذبہ تیرے عروج کا آلِ عبا کی برتری

جھلکیاں تیرے ناز کی جنبشِ کاکلِ حسینؑ
رنگ ترے نیاز کا گردشِ چشمِ جعفری

شان ترے ثبات کی عزمِ شہیدِ کربلاؑ
شرح ترے جلال کی ضربتِ دستِ حیدری

رنگ ترے شباب کا جلوۂ اکبرؑ قتیل
نقش ترے شکیب کا خونِ گلوئے اصغریؑ

تیرا لباسِ فاخرہ چادر کہنۂ بتولؑ
تیری غذائے خوش مزا نانِ شعیرِ حیدریؑ

تجھ پہ نثار، جان و دل مڑ کے ذرا یہ دیکھ لے
دیکھ رہی ہے کس طرح، ہم کو نگاہِ کافری

اُٹھ کہ ترے دیار میں پرچمِ کفر کھُل گیا
دیر نہ کر کہ پڑ گئی صحنِ حرم میں ابتری

۵

اس نگاہِ ناز نے دیکھا حریفانہ مجھے
یہ تعلق کر گیا کس کس سے بیگانہ مجھے

مانگتا ہوں اپنے سوزِ عشق کی ہر وقت خیر
شمع میں جلتا نظر آتا ہے پروانہ مجھے

جلوۂ گل سے یہاں طاری ہے عالم دوسرا
موسمِ دیوانہ گر سمجھا ہے دیوانہ مجھے

بڑھ گئیں حیرانیاں بھی جلوہ ارزانی کے ساتھ
تیرا ایک ایک آئنہ ہے آئینہ خانہ مجھے

اک نگاہِ مست کی اللہ رے کیف انگیزیاں
دردِ یک ساغر ہے میخانے کا میخانہ مجھے

ہر صدائے خندۂ گل پر یہ ہوتا ہے گماں
میرے مُنھ پر کہہ رہا ہے کوئی دیوانہ مجھے

تلخیٔ مے لذّتِ کام و دہن ہے ساقیا
دے شرابِ تلخ پیمانہ بہ پیمانہ مجھے

اِس طرح سُنتا ہوں میں ایک ایک کی رودادِ غم
جس طرح کوئی سُنائے میرا افسانہ مجھے

کون سی منزل ہے تابشؔ یہ جنونِ عشق کی
عرصہ یک گام ہے ایک ایک ویرانہ مجھے

رازمرادآبادی

رازمرادآبادی ایک ملنگ صفت ہمدرد اور ہردلعزیز تھے۔ صاف گوئی اور بیباکی ان کے مزاج میں داخل تھی۔ بے تکلفی کی وہ جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ان کے وجود سے محفلوں میں بڑی رونق رہتی تھی۔ ان کا شیوہ انسان دوستی اور رواداری تھا جس کا عکس ان کے کلام میں جابجا ملتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے نظمیں بھی لکھیں مگر بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ حرفِ راز پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح وہ زندگی کو سمجھتے اور برتتے تھے اسی کو انہوں نے اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ احساس کی تازگی اور رنگینیٔ جذبات سے بھی ان کا کلام بھرا ہوا ہے۔ اگر ان کے کلام کو بغور پڑھا جائے تو یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وہ تخیل سے زیادہ جذبات پر توجہ دیتے تھے۔ جذبات کی گہرائی اور اثر انگیزی ان کی غزلوں کا خاص وصف ہے۔ جگر کے شاعرانہ مزاج سے ان کو احساس کے حوالے سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ البتہ جگر کے ہاں کہیں کہیں باریکی کا جو عنصر ملتا ہے وہ راز صاحب کے ہاں مفقود ہے۔

کیا بتاؤں یہ راز کیا ہوں میں
خاکِ دہلیزِ مصطفےٰؐ ہوں میں

ہاں گنہگار ہوں، بُرا ہوں میں
لاج رکھ لیجیے، آپ کا ہوں میں

بابِ جبریل پہ کھڑا ہوں میں
نور ہی نور دیکھتا ہوں میں

جُھک گئی ہے نظر بہ پاسِ ادب
سر سے پا تک لرز رہا ہوں میں

ہر طرف ہے تجلّیوں کا ہجوم
اور جلوؤں میں کھو گیا ہوں میں

لوگ کہتے ہیں یہ مدینہ ہے
درِ اقدس پہ آگیا ہوں میں

خاکِ طیبہ کو منھ پہ ملتا ہوں
ذرّے ذرّے کو چومتا ہوں میں

نعت پڑھ پڑھ کے جالیوں کے قریب
آپ ہی آپ جھومتا ہوں میں

روضۂ مصطفےٰؐ کا کیا کہنا
جیسے جنّت میں آگیا ہوں میں

میں کہاں اور درِ حضورؐ کہاں
سو رہا ہوں کہ جاگتا ہوں میں

ہاتھ اٹھنے لگے دُعا کے لیے
اُن سے مصروفِ التجا ہوں میں

آپؐ مولائے کُل ہیں داتا ہیں
میرا کیا پوچھنا، گدا ہوں میں

میری جھولی حضور بھر دیجے
دولتِ درد مانگتا ہوں میں

میرا حامی خدا اور اسکا رسولؐ
خادمِ فخرِ انبیا ہوں میں

فدا خالدی

جناب فدا خالدی ان فنکاروں میں سے ایک ہیں جنہیں روایتی غزل کو سنوارتے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا ہے۔ فدا خالدی صاحب کے کلام سے ان کی کہنہ مشقی اور استادی نمایاں ہے۔ انہوں نے بیخود دہلوی اور سائل دہلوی کا زمانہ خوب دیکھا ہے۔ اور اس دور کی غزل گوئی سے ان کا گہرا فکری رشتہ ہے۔ الفاظ کے الٹ پھیر اور زبان کی سادگی سے ان کا کلام مزین ہے۔ انہیں علم عروض سے گہرا شغف ہے۔ زبان اور بیان کے روایتی اصولوں کو اپناتے ہوئے فدا خالدی نے مخصوص طبقہ کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔ سوز و گداز اور حسنِ ادا ان کے کلام سے آشکار ہے۔ شاعرانہ محاسن کا بھی انہیں خیال رہتا ہے۔ وہ فکر اور زبان دونوں کو یکساں اہمیت دیتے اور جدید شاعری کے بہت سے رجحانات کو ناپسند کرتے ہیں۔ آزاد شاعری اور جدید ہیئتوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ غزل میں حسن تغزل کے قائل ہیں اور غزل کو شاعری کی آبرو سمجھتے ہیں۔ اساتذۂ کہن کی ایسی چند یادگاریں ہی اب باقی ہیں جن سے روایتی غزل کا بھرم قائم ہے۔ اگرچہ انہوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کی محبوب صنف غزل ہی ہے۔

مجھے شاہِ دیں کی تلاش ہے، کہ جہاں میں ایسا سخی نہیں
جو وہ مل گئے تو کہیں مجھے، کسی چیز کی بھی کمی نہیں
مری زندگی تری جستجو، تری جستجو مری آرزو
کہ مری نظر میں ہے تو ہی تو، مرے دل پہ رنگِ دوئی نہیں
مرے رہنما مرے راہبر، ابھی اک نگاہِ کرم ادھر
کہ بھٹک نہ جاؤں اِدھر اُدھر، مرے ساتھ اور کوئی نہیں
یہ جمالِ انجم و کہکشاں، یہ بہارِ لالہ و بوستاں
وہ مقام کونسا ہے جہاں، مرے شہ کی جلوہ گری نہیں
جو مقامِ قرب تمہیں ملا، وہ نصیب اور کسے ہوا
جہاں تم ہو سرورِ انبیا، وہاں اور کوئی نبی نہیں
ابھی اور پردے اُٹھایئے، ابھی اور جلوے دکھایئے
مئے دید اور پلایئے، ابھی آگ دل کی بجھی نہیں
میں فدائے سرورِ انبیا، مجھے کام اور کسی سے کیا
مجھے اُن کے ذکر سے واسطہ، مرے دل میں اور کوئی نہیں

دردِ دل کے واسطے اک چارہ گر کی ہے تلاش
جو مدینے لے چلے اُس راہبر کی ہے تلاش

قربِ سلطانِ دو عالم جس سے ہو جائے نصیب
میرے دل کو ایسے دردِ پُر اثر کی ہے تلاش

کیف جو بخشے نظر کو وہ توجہ چاہیئے
روشنی دل کو جو دے ایسی نظر کی ہے تلاش

کھو گئے ہیں جستجوئے شاہِ دو عالم میں ہم
اب نہ ساماں کی ضرورت ہے نہ گھر کی ہے تلاش

جس کے سجدے بارگاہِ قدس میں مقبول ہوں
اب جبینِ شوق کو اس سنگِ در کی ہے تلاش

تھی نظر محوِ تجسّس جب نہ پایا تھا انہیں
مل گئے وہ تو مجھے اپنی نظر کی ہے تلاش

شام ایسی چاہیئے لے جائے جو شہ تک فدا
ظلمتیں جس سے مٹیں ایسی سحر کی ہے تلاش

○

کیوں اہتمامِ عرضِ تمنّا کرے کوئی
آئینہ بن کے اُن کا نظارا کرے کوئی

کیا فائدہ کسی کی تمنّا کرے کوئی
اپنی نظر سے آپ ہی کھیلا کرے کوئی

جب رسم و راہِ حُسن سے پیدا کرے کوئی
میری تباہیوں کا نظارا کرے کوئی

مانا کہ جورِ حُسن میں بے ربطیاں بھی ہیں
لیکن مجال کیا ہے کہ شکوا کرے کوئی

میرے سکونِ قلب پہ گرتی ہیں بجلیاں
آنکھوں میں اشک بھر کے نہ آیا کرے کوئی

سلیم احمد

سلیم احمد ایک بلند پایہ نقاد، شاعر اور ڈرامہ نگار تھے۔ ان کی شاعری میں بے باکی بھی ہے اور رمزیت و ایمائیت بھی انہوں نے متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا۔ پابند نظم بھی کہی اور آزاد بھی۔ وہ روایت کے بھی امین تھے اور جدیدیت کے علمبردار بھی، اس امتزاج سے ان کی شاعرانہ توانائی نے استحکام حاصل کیا۔ انہوں نے بطور خاص اس امر کا خیال رکھا کہ جس موضوع کے لئے جو ہیئت فطری اور موزوں ہو اسے اختیار کیا جائے اور اس کو برتنے میں ان کا تنقیدی شعور ہی ان کا ایک معتبر رہبر بنا۔ انسانیت کی زبوں حالی اور حالات کی بے یقینی بھی ان کے کلام میں مخصوص انداز سے ملتی ہے۔ وہ لفظوں کو تاثیر عطا کرنے کے قائل تھے لہٰذا ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ جو بھی تخلیق سامنے آئے اس میں اثر آفرینی کا عنصر غالب رہے۔ انہوں نے جس حوصلے سے الفاظ کا انتخاب اور استعمال کیا اس سے ان کی فنکاری نمایاں ہے۔ ان کے کلام کی تہہ داری بھی الفاظ کو مخصوص انداز سے برتنے کے سبب پیدا ہوئی۔

سلیم احمد ایک ایسے شاعر تھے جنہوں نے تاریخی اور تہذیبی عناصر کو بھی اپنے کلام میں خصوصی جگہ دی۔ ان کا فکری سرمایہ مقصدیت کا آئینہ دار ہوتے ہوئے حقائق کا آئینہ دار ہے۔

اظہارِ حالِ دل پہ ہے اصرار دیکھنا
ظاہر پرست، کتنے ہیں غم خوار دیکھنا

یاراں ہم اہلِ عشق ہیں ہم پر حرام ہے
فردِ حسابِ اندک و بسیار دیکھنا

اس آنکھ کے سوا نہ کسی کو ہوا نصیب
رنگِ مزاجِ عشق خود آزار دیکھنا

بیٹھے ہیں سب سکون سے کہتا نہیں کوئی
کیسا یہ شور ہے پسِ دیوار دیکھنا

اے پاسبانِ شب کوئی دزدِ سحر نہ ہو
پچھلے پہر یہ کون ہے بیدار دیکھنا

اک ساحلِ امید سے طوفانِ یاس تک
موجِ خیالِ یار کی رفتار دیکھنا

دن سا پہاڑ کاٹ لیا شام ہو گئی
اب کیا سلیمؔ سایۂ دیوار دیکھنا

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

کچھ بھی نہ لغزشِ نگہہ یار دیکھنا
بس اپنے آپ ہی کو گنہ گار دیکھنا

کچھ بھی نہ دیکھنے کی اذیت نہیں ہے سہل
کچھ اس سے بھی زیادہ ہے دشوار دیکھنا

گرد و غبار شہر میں بارش کی دیر ہے
ڈھل جائیں گے یہ سب در و دیوار دیکھنا

خواہش تو محترم ہے وہ خواہش کسی کی ہو
اس زاویے سے حسرتِ اغیار دیکھنا

تجھ سے وفا نہ چاہی کہ منظور ہی نہ تھا
اس قید میں تجھے بھی گرفتار دیکھنا

کیا جانے انتظار کو کیا رنگِ خواب دے
یہ شام ہی کو صبح کے آثار دیکھنا

یہ دل ہے ایک خانۂ ویراں مگر سلیم
جلتا ہے اِک دیا سرِ دیوار دیکھنا

اقبال عظیم

پروفیسر اقبال عظیم ایک منجھے ہوئے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں جذبات کی فراوانی اور زبان کی سادگی و روانی قابلِ ذکر ہے۔ الفاظ کی الٹ پھیر سے بعض وقت ان کے اشعار میں وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو عمیق فکر سے بمشکل ممکن ہوتی ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ نعت و منقبت گوئی اور سلام نگاری میں بھی انہیں مہارت ہے۔ عقیدت کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کی چاشنی سے ان کا مدحیہ کلام دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ کہتے بھی اچھا ہیں اور پڑھتے بھی ہیں تو بہت ہی اچھوتے انداز میں جس سے محفل میں جان پڑ جاتی ہے۔

○

سوزِ دل چاہیئے چشمِ نم چاہیئے اور شوقِ طلب مُعتبر چاہیئے
ہوں مُیسّر مدینے کی گلیاں اگر، آنکھ کافی نہیں ہے نظر چاہیئے

ان کی محفل کے آداب کچھ اور ہیں لب کشائی کی جرأت مناسب نہیں
ان کی سرکار میں التجا کے لیے جنبشِ لب نہیں چشمِ تر چاہیئے

اپنی رُودادِ غم میں سناؤں کسے، میرے دکھ کو کوئی اور سمجھے گا کیا
جس کی خاکِ قدم بھی ہے خاکِ شفا، میرے زخموں کو وہ چارہ گر چاہیئے

میں گدائے درِ شاہِ کونین ہوں، شیش محلوں کی مجھ کو تمنا نہیں
ہو مُیسّر زمیں پر نہ زیرِ زمیں، مجھ کو طیبہ میں اک اپنا گھر چاہیئے

رونقیں زندگی کی بہت دیکھ لیں، اب میں آنکھوں کا اپنی کروں گا کیا
اب نہ کچھ گفتنی ہے نہ کچھ دیدنی، مجھ کو آقا کی بس اک نظر چاہیئے

ان نئے راستوں کی غلط روشنی ہم کو راس آئی ہے اور نہ راس آئے گی
ہم کو کھوئی ہوئی روشنی چاہیئے، ہم کو آئینِ خیر البشر چاہیئے

گوشہ گوشہ مدینے کا پُر نور ہے، سارا ماحول جلووں سے معمور ہے
شرط یہ ہے کہ ظرفِ نظر چاہیئے، دیکھنے کو کوئی دیدہ ور چاہیئے

مدحتِ سرورِ دوجہاں کے لیے صرف لفظ و بیاں کا سہارا نہ لو
فنِ شعری ہے اقبالؔ اپنی جگہ، نعت کہنے کو خونِ جگر چاہیئے

شان الحق حقی

شان الحق حقی کو لسانیات اور مضمون نگاری سے بھی لمس ہے اور وہ غزل کے معتبر شاعر ہیں۔ کثرت مطالعہ کے سبب ان میں کلاسیکی رچاؤ بھی پایا جاتا ہے اور جدید مسائل پر بھی ان کی توجہ رہی ہے۔ ان کی غزلوں میں روایت کا حسن بطور خاص نمایاں ہے۔ وہ جذبے اور فکر کی ہم آہنگی سے اپنی شعری دنیا میں رنگ بھرتے رہے ہیں۔ ان کے کلام سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایسے شاعر کی فکر ہمارے سامنے ہے جو بہار اور خزاں دونوں موسموں سے واقف ہے اور نشاط و کرب کی کیفیتوں کو خوب سمجھتا ہے اور دوسروں کو بھی ان حقائق سے آشنا ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ حقی صاحب کی شاعری میں ایک ذی شعور فنکار کے خواب اور مثالیے ملتے ہیں وہ اساطیری ادب کے بجائے اپنے گرد و پیش کے شعور سے حقائق اخذ کرنے کو اہمیت دیتے ہیں۔

گویا ان کی سخن آرائی ایک ایسا چمنستان ہے جس میں احساسات کی رنگینیاں اور جذبات کی رعنائیاں پائی جاتی ہیں۔

غنیمت ہے یہی شاید کہ زخمِ دل ہے نادیدہ
پڑے ہیں اُس کی راہوں میں ہزاروں غنچۂ چیدہ

ذرا دامن کو چھو لیجے تو ہو جاتے ہو رنجیدہ
کبھی مدہوش متوالے کبھی بنتے ہو فہمیدہ

چھُپایا ہی نہیں جاتا خمارِ شوق پوشیدہ
ترے کوچے میں اُٹھتے ہیں قدم لغزیدہ لغزیدہ

وہ بیٹھے ہیں خفا ہو کر بڑے سنجیدہ سنجیدہ
کچھ اپنے دل سے ہوتے ہیں سخن پوشیدہ پوشیدہ

وہی اک حُسنِ بے پیکر وہی اک دستِ بے دیدہ
صنم ہیں میرے بُت خانے کے اب تک ناتراشیدہ

رہا ہر رنگ دُھندلا سا رہا ہر روپ پوشیدہ
نہ اُترا زندگی بھر میں خمارِ چشمِ خوابیدہ

عجب کیا راہِ ہستی پر اگر ہیں پاؤں لغزیدہ
سراسیمہ چلے آئے تھے یونہی اُٹھ کے طلبیدہ

رَواں ہے سازِ دل پر زخم ورکا دَست نادیدہ
ٹھہر جائے گا آخر رفتہ رفتہ تارِ لرزیدہ

○

وہ مزار رکھتے ہیں کچھ تازہ فسانے اپنے
بھولتے جاتے ہیں سب درد پرانے اپنے

حال میں اپنے کچھ اس طرح مگن ہیں گویا
ہم نے دیکھے ہی نہیں اگلے زمانے اپنے

کرکے اک بار تری چشمِ فسوں گر کے سپرد
پھر نہ پوچھا کبھی بندوں کو خدا نے اپنے

ہم وہی ہیں کہ جہاں بات کسی نے پوچھی
خوش گماں ہو کے لگے داغ دکھانے اپنے

بزمِ یاراں میں وہ اب کیف کہاں ہے باقی
روز جاتے ہیں کہیں جی کو جلانے اپنے

ہمنشیں دوست کی صورت تو کہاں ملتی ہے
چین سے وہ ہے جو دشمن کو نہ جانے اپنے

دور کتنا ہی ترے بام سے بھٹکا ہو خیال
طائروں کو کبھی بھولے ہیں ٹھکانے اپنے

بستیاں دل کی بھی ویراں ہیں نگاہوں کی طرح
ہیں ابھی ہم کو بہت شہر بسانے اپنے

نو بنو روز دکھاتی ہے کرشمے دنیا
آسماں کے وہی انداز پرانے اپنے

ذکر سے اُس کے سنوارا ہے سخن کو حقیؔ
خوش مزا لگتے ہیں کانوں کو ترانے اپنے

ادا جعفری

محترمہ ادا جعفری ایک کہنہ مشق شاعرہ ہیں۔ انہوں نے ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور اس زمانے میں نام پیدا کیا جب خواتین بحیثیت شاعرات اس طرح سرگرمِ عمل نہیں ہوتی تھیں۔ عصرِ حاضر میں ادا جعفری نے شاعرات کے لئے ایسی راہ ہموار کی کہ متعدد شاعرات کو منظرِ عام پر آنے کا حوصلہ ملا۔ ادا جعفری کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ جدیدیت کی طرف ایک حد تک مائل ہیں۔ وہ پابند شاعری بھی کرتی ہیں اور آزاد نظمیں بھی کہتی ہیں۔ انہیں شعر گوئی میں مہارت حاصل ہے فکری اعتبار سے ان کا کلام معیاری ہے اور عصری تقاضوں کا آئینہ دار ہوتے ہوئے مقصدیت سے ہمکنار بھی ہے۔ جدید اور قدیم الفاظ اور تراکیب کا استعمال ان کے ہاں بڑی عمدگی اور شائستگی سے پایا جاتا ہے۔ ادا جعفری کو بجا طور پر ایک قادر الکلام شاعرہ کہا جا سکتا ہے۔

مجھے مژگاں اُٹھانے کی اجازت دے

کہ تو آج اپنے سائے تک سے لرزاں ہے
سیہ نفرت کی زنجیرِ گراں پہنے
زمانے بھر میں سرگرداں
زمانے بھر سے نالاں ہے
کبھی نیلے سمندر سے نہنگ اُمڈے
کبھی ادوی گھٹاؤں سے لہو برسا
یہ عالم ہے کہ آئینوں سے خوف آیا
اندھیرا سا اندھیرا ہے

مجھے مژگاں اُٹھانے دے
تو شاید میری آنکھوں سے
وہ کرنیں تجھ کو مل جائیں
بھری دُنیا میں تو جن کو گنوا بیٹھا
مرے ہاتھوں میں ہیں اوراق گم گشتہ تمنّا کے
نویدِ صبحِ فردا کے
کہ میں انسان کی پہلی وفا پہلی محبّت کی نشانی ہوں!

○

راستہ روک رہی ہو جیسے
یاد راہوں میں کھڑی ہو جیسے

نکہتِ موجۂ گل یوں آئے
بھید سا کھول رہی ہو جیسے

اُٹھتے اُٹھتے کوئی محبوب نگہ
اپنے سائے سے ڈری ہو جیسے

یا کسی خواب نے آنکھیں کھولیں
یا عبادت کی گھڑی ہو جیسے

گھر کے آنگن میں نہ اُترے سورج
رات گھبرا سی گئی ہو جیسے

وہ جو دیوار میں چنوائی گئی
کوئے جاناں کو چلی ہو جیسے

وہ جو گیتوں کی دھڑکتی لَو تھی
شعلۂ جاں میں ڈھلی ہو جیسے

فرض تھا حرفِ تمنا کس پر
زندگی پُوچھ رہی ہو جیسے

ہم جسے سنگِ گراں سمجھے تھے
اپنی ہی سادہ دلی ہو جیسے

پھر شرارہ کوئی ارزاں ہوگا
راکھ پلکوں پہ جمی ہو جیسے

مہرباں چشمِ گُہر بار ادا
اور کسی شے کی کمی ہو جیسے

اطہر نفیس

اطہر نفیس سراپا عشق تھا۔ اس نے محبت کی اور اس کا جسم ہجر کا تپتا ہوا صحرا تھا پھر بھی وہ مسکراتا تھا۔ اسے ہمیشہ کٹھنائیوں اور دشواریوں سے مقابلہ کرنا پڑا اس لئے اس کا کلام تلخ حقائق کو سوز و گداز کی آنچ میں ڈھالے ہوئے ہے۔ آفتابی شعاعوں کی پرچھائیوں سے محروم رہنے والا یہ شاعر اندھیروں میں نہیں بھٹکا بلکہ اس نے بڑی حوصلہ مندی سے مصائب و ابتلا کو برداشت بھی کیا اور ایک ایسا دلدوز تیکھا لہجہ اختیار کیا کہ جسکی تپش سے ہر اہل دل متاثر ہوتا ہے

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ احساسات اور جذبات کی عکاسی فن کا بنیادی تقاضہ ہے اس معاملہ میں اطہر نفیس ایک کامیاب فنکار کی حیثیت سے اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوا۔ اس کے ذہنی خطوط کی تصویر کشی سے اس کی شاعری کا مزاج بڑا ہی دھیما اور پُرسوز نظر آتا ہے۔ سوز و گداز کا عنصر عام طور پر اکثر شعراء میں کم و بیش پایا ہی جاتا ہے مگر اطہر نفیس نے عشق کی تمازت اور ہجر کی بے تابی کے زیر اثر جس طرح شعر گوئی کی طرف توجہ دی اس سے اس کے کلام میں ایسی پختہ کاری پائی جاتی ہے جس کے سبب اس کی آواز اپنے ہم عصروں میں نمایاں ہو گئی۔